تحقیق تصوف و عرفان

(علامہ محمد حسین نجفی کی ''بطلان تصوف و عرفان'' کا تنقیدی جائزہ)

آیت اللہ ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی

نام کتاب: تحقیق تصوف وعرفان

مؤلف : آیت اللہ ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی

اشاعت: اول۔سال2016

تعداد: ایک ہزا

طابع: معراج دین پرنٹنگ پریس۔لاہور

قیمت:

www.drhamadani.com

syedniazm@yahoo.com

www.youtube.com/user/ehsaantv

www.dailymotion.com/syedniazm

www.facebook.com/DrNiazMuhammadHamadani

ناشر: شعبہ تبلیغات دفتر آیت اللہ ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست عناوین

تعارف

آیت اللہ شیخ محمد حسین نجفی صاحب دام ظلہ کی شخصیت اوران کی علمی اور دینی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔موصوف پاکستان کے معروف اور صاحب نظر عالم دین ،مجتہد اور مرجع تقلید ہیں اور بیرون ملک بھی کافی معروف ومقبول ہیں۔انہوں نے تحریروتقریر کے ذریعے قابل قدر علمی خدمات انجام دی ہیں۔انہوں تقریباً ہر شعبے میں کتب تالیف کی ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ علم کلام،علم فقہ اورعلم حدیث کے میدانوں کے سوار ہیں اور انہی میدانوں میں ان کے کاموں کا معیار اچھا ہے۔احسن الفوائد، سعادت الدارین، تجلیات صداقت ان کی بلند پایہ اور معیاری تالیفات ہیں۔شیعہ احادیث کے عظیم ذخیرے وسائل الشیعہ کا اردو میں ترجمہ بھی ان کا قابل قدر کارنامہ ہے۔جزاہ اللہ خیرا لجزاء

کچھ عرصہ پہلے موصوف کی تالیفات میں ایک اور کتاب منظر عام پر آئی جس کا نام ہے: اقامۃ البرہان علی بطلان التصوف والعرفان۔اس کتاب کے بارے میں بعض دوستوں سے سنا تھا مگر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ چونکہ روایتی فقہ وکلام کی طرح روایتی تصوف وعرفان سے بھی کچھ مقامات پر ہمیں اختلاف ہے،لہٰذا علامہ صاحب کی یہ کتاب پڑھنے کا بہت اشتیاق پیدا ہوکہ شاید اس میں کوئی مفید بات مل جائے۔ پھر ایک محترم دوست کی وساطت سے یہ کتاب مل گئی۔لیکن خدالگتی بات یہ ہے کہ اس کتاب کو دیکھ کر بہت دکھ ہوا اور بہت مایوسی ہوئی۔کتاب کا نام تو اقامۃ البرہان ہے لیکن اس میں برہان نام کی کوئی چیز دور دور تک نظر نہیں آتی۔اس سے بھی بڑھ کر تکلیف دہ بات یہ کہ یہ تالیف پرویز کی کتاب ''تصوف کی حقیقت'' کا چربہ ہے،جس میں تشیع کا تڑکا لگا دیا گیا ہے۔تحقیق کے معیار سے دیکھا جائے تو یہ کتاب تحقیق کے اصول اور معیار پر بالکل پوری نہیں اترتی۔احسن الفوائد،سعادت الدارین،تجلیات صداقت میں علم، تحقیق ،استدلال اوراخلاص کا جو مظاہرہ دیکھنے کوملتا ہے اس کتاب میں معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔یہ بات کہتے ہوئے بہت دکھ محسوس کررہا ہوں لیکن کہنے پر مجبور ہوں کہ کاش علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے نے

تصوف وعرفان کی رد میں خامہ فرسائی کرنے سے پہلے تصوف کی کوئی معیاری کتاب ہی پڑھ لی ہوتی۔ انتہائی معذرت کے ساتھ، موصوف کی تحریر پڑھ کر یہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت ہو جاتی ہے کہ انہوں نے تصوف وعرفان کی کسی معیاری اور مستند کتاب کا مطالعہ نہیں فرمایا ہوا۔

اصل اور نقل:

بدقسمتی سے ہماری دنیا میں ہر اچھی اور صحیح چیز کی غیر معیاری اور نادرست نقلی صورت بھی پائی جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہر چیز میں ایک نمبر اور دو نمبر چیز پائی جاتی ہے۔ کیا اسلام کا دعویٰ کرنے والے ہر شخص کے پاس ایک نمبر اسلام ہے؟ کیا تشیع کے نام پر دو نمبر تشیع پیش نہیں کیا جا رہا؟ کیا دو نمبر ڈاکٹر، انجنیر، عالم اور مفتی موجود نہیں ہیں؟ اب اگر کوئی شخص دو نمبر چیز کو سامنے رکھ کر اصل پر تنقید کرنا شروع کر دے تو کیا یہ عادلانہ اور قابل تعریف بات ہوگی؟ ہرگز نہیں۔

پاکستان روئے زمین کا واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا۔ تحریک پاکستان کے زمانے میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کا مقصد یہ تھا کہ ہم ایک ایسی آزاد مملکت کا قیام چاہتے ہیں جہاں اسلام کے احکام کے مطابق آزادی سے زندگی بسر کر سکیں، جہاں اسلام کے اصولوں کی حاکمیت ہو اور اسلام کے مطابق زندگی گزارنے میں کوئی رکاوٹ اور دشواری نہ ہو۔

اگر آج غیر مسلم دنیا کا کوئی شخص یہ سوچے کہ چلو پاکستان جا کر دیکھتے ہیں کہ اسلام کیا ہے جس کے لیے برصغیر کے مسلمانوں نے اتنی قربانیاں دی تھیں۔ پھر وہ پاکستان آ جائے اور یہاں آ کر اسلام کے نام پر ہونے والے فتنہ وفساد کو دیکھے، حکومت اور سرکاری اداروں میں ہونے والی بدعنوانی اور کرپشن کو دیکھے، دین کے نام پر پھیلائی جانے والی جہالت اور دین کے نام پر کی جانے والی دہشت گردی اور سفاکانہ خونریزی کو دیکھے اور پھر یہ رائے قائم کرے کہ اسلام فتنہ وفساد، بدعنوانی و کرپشن، دہشت گردی، خونریزی اور سفاکی کا دین ہے تو کیا اس کی بات صحیح ہوگی؟ اگر وہ ایسی بات کرے گا تو ہر صاحب عقل وبصیرت شخص اسے کہے گا کہ بھائی تم نے دو نمبر کے مسلمان دیکھے ہیں جن کا اصل اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو اصل اور ایک نمبر کے اسلام کا مطالعہ کرو۔

اسی طرح ہمارے منبر، مجالس عزا اور مراسم عزاداری میں ہونے والی غیر شرعی باتوں کو دیکھ کر اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تشیع یہ ہے جو منبروں سے پیش کیا جا رہا ہے، تو اس کی بات میں کتنی صداقت ہوگی؟

یہی حال تصوف اور صوفیاء کا بھی ہے۔ وہاں بھی دو نمبر کا تصوف اور دو نمبر کے صوفی پائے جاتے ہیں۔ وہاں بھی خانقاہوں میں، عرسوں میں، مزارات پر ایسی چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں جس کا اصل تصوف سے دور دور تک کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ اگر دو نمبر کے اسلام اور مسلمان کو دیکھ کر اصل اسلام اور مسلمان کو، اور دو نمبر کے تشیع اور شیعہ کو دیکھ کر اصل تشیع کو غلط سمجھنا اور غلط کہنا درست نہیں ہے تو دو نمبر کے تصوف اور صوفی کو دیکھ کر اصل تصوف کو غلط کہنا بہت بڑی بے انصافی ہوگی۔

عادلانہ رویے کی ضرورت:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو واضح الفاظ میں حکم دیا ہے:

وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَئَانُ قَوْمٍ عَلَىٰ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى

اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں ایسا مجرم نہ بنا دے کہ تم عدل نہ کرو۔

عدل کرو، یہ سب سے بڑھ کر تقویٰ کے قریب ہے۔ (مائدہ:8)

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا

اور جب تم بات کرو تو عدل کرو۔ (انعام:152)

ان دو آیات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دشمن کے ساتھ بھی عدل کرنے کا تاکیدی حکم دیا ہے اور فرمایا کسی قوم کی دشمنی میں ایسے مجرم نہ بن جاؤ کہ عدل نہ کرو۔ دشمن سے بھی عدل کرو۔ نیز یہ کہ جب بھی بات کرو، جس کے بارے میں بات کرو، خواہ دشمن کے بارے میں بات کرو، تو بات کرنے میں بھی عدل کرو، کسی کے بارے میں ایسی بات بھی نہ کرو جو عدل و انصاف پر مبنی نہ ہو۔ اقامۃ البرہان میں ان دونوں قرآنی آیات کی واضح اور صریح خلاف ورزی کی گئی ہے۔

تصوف کے بارے میں اگر انصاف کی بات کرنی ہے تو اصل تصوف کو اور ایک نمبر صوفی کو دیکھنا ہوگا۔ اقامۃ البرہان کے مطالعہ سے یہ احساس بہت قوت کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ مؤلف محترم دام ظلہ

نے اصل تصوف کی کوئی کتاب پڑھے بغیر اور کسی حقیقی صوفی کو دیکھے بغیر تصوف کے بارے میں سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر اور دونمبر صوفیا کے غلط طرز عمل کو دیکھ کر تصوف اور صوفیاء کے بارے میں ایک رائے قائم کی ہوئی ہے جو سو فیصد غلط اور قرآنی احکام اور عقل و شریعت مطہرہ کے موازین عدل و انصاف سے کوسوں دور ہے۔ مؤلف محترم دام ظلہ نے دونمبر کے جعلی اور جاہل پیروں اور تعویذ گنڈے کرنے والے عاملوں کو سامنے رکھ کر تصوف اور عرفان پر جو تنقید کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ علم و تحقیق کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی بلکہ سنگین بے انصافی اور تعصب کے زمرے میں آتی ہے۔

انصاف اور تحقیق کا تقاضا یہ ہے کہ ہر بات کی دلیل دی جائے اور دقیق حوالوں کے ساتھ بات کی جائے۔ اگر کسی نظریے کی رد کرنا مقصود ہو تو پہلے اصل نظریے کو اس کے معتبر اور مستند مآخذ سے نقل کیا جائے پھر اس پر نقد و جرح کی جائے۔ لیکن اس کتاب میں مؤلف محترم دام ظلہ نے یا تو سرے سے کوئی حوالہ ہی نہیں دیا اور سنی سنائی باتیں نقل کر دیں اور جو تھوڑے بہت حوالے دیئے گئے ہیں وہ بھی انتہائی ناقص ہیں۔ حوالے میں جلد اور صفحہ کا ذکر کیے بغیر محض کسی کتاب کا نام لکھ دینا تحقیق کے لحاظ سے ایک ناپسندیدہ بات سمجھی جاتی ہے۔

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کی کتاب میں غلطیوں اور بے انصافیوں کی بھرمار ہے۔ اگر ہم ان سب کی نشاندہی کرنے بیٹھیں تو بقول رومی ''مثنوی ہفتاد من کاغذ شود'' والی بات ہو جائے گی۔ لہٰذا اپنی اس ناچیز کاوش میں ان شاء اللہ ہم ان کی کتاب ''اقامۃ البرہان'' کی کچھ چیدہ چیدہ کمزوریوں، مؤلف کی تضاد گوئی، نفس مضمون سے ان کی ناواقفیت اور ان کے تعصب و عناد کی کچھ مثالوں کی نشاندہی کریں گے۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی بہت ضروری ہے کہ اس کتاب کی تالیف کا مقصد روایتی تصوف و عرفان کی سو فیصد حمایت نہیں ہے۔ جس طرح روایتی فقہ، اصول الفقہ، فلسفہ، کلام، حدیث اور تفسیر میں بہت سے غلطیاں اور نقائص پائے جاتے ہیں اور ان میں اصلاح کی ضرورت ہے بالکل اسی طرح روایتی تصوف و عرفان بھی غلطیوں سے مبرا نہیں ہے۔ اس کتاب کی تالیف کا مقصد صرف یہ ہے کہ عرفان اور تصوف پر ہونے والی ناجائز اور غیر منصفانہ تنقید یا مخالف کو آشکار کیا جائے۔

اس کتاب میں حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ ہر بات کرتے وقت آیت اللہ محمد حسین نجفی دام

ظلہ کے احترام کو ضرور ملحوظ رکھا جائے۔عرفان وتصوف کے موضوع پر ان سے علمی اختلاف کے باوجود ان کی شخصیت اور ان کی خدمات یقیناً قابل احترام بلکہ واجب الاحترام ہیں ۔لیکن اس بات کا امکان ہے کہ نادانستہ طور پر کوئی تلخ یا نامناسب لفظ یا جملہ قلم سے ادا ہو گیا ہو۔اگر ایسا ہوا ہو تو یہ علامہ صاحب دام ظلہ کے سخت تند و تیز جملوں اور جارحانہ حملوں کا قدرتی اور غیر شعوری ردعمل ہے جس پر ہم ان سے اور ان کے ارادتمندوں سے معذرت خواہ ہیں ۔امید ہے وہ ہمیں معاف فرمائیں گے۔

الفقیر الی رحمت رب العالمین

ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی

7مارچ 2016

ابتدائیہ

مؤلف اقامۃ البرہان جناب آیت اللہ محمد حسین نجفی دام ظلہ نے اپنی کتاب کے پہلے دو ابواب میں دین اسلام کے اصول دین، فروع دین اور صفات ثبوتیہ اور صفات سلبیہ وغیرہ کا اختصار سے ذکر کیا ہے۔ جزاہ اللہ خیرا۔ اسی طرح انہوں نے صفحہ 10 پر" افتراق امت کا واحد سبب" کے عنوان کے تحت حدیث ثقلین کی روشنی میں گفتگو فرمائی ہے۔ اصولی طور پر ان کی یہ گفتگو صحیح ہے لیکن نامکمل ہے۔ حدیث ثقلین سے دوری کا نتیجہ صرف افتراق امت ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر بھیانک ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

حدیث ثقلین

حدیث ثقلین شیعہ اور سنی دونوں کے ہاں متفقہ صحیح حدیث ہے:

انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اھل بیتی، ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا ابعدی، و انھما لن یفترقا حتیٰ یردا علی الحوض

ترجمہ: میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اللہ کی کتاب اور اپنی عترت اپنے اہل بیت، جب تک تم ان دونوں کے ساتھ وابستہ رہو گے میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہو گے، اور یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ ایک ساتھ حوض پر میرے پاس پہنچ جائیں گے۔

اس حدیث کی روشنی میں بات آگے بڑھانے سے پہلے اس مثال پر توجہ فرمائیں۔ کسی گاؤں میں ایک ہائی سکول ہے۔ محکمہ تعلیم ہائی سکول میں سائنس کا مضمون پڑھانے کے لیے ایک قابل اور

باصلاحیت سائنس ٹیچر کا تقرر کر دیتا ہے۔لیکن کچھ لوگ اپنے مفادات کی خاطر سازشوں کے ذریعے ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ سائنس ٹیچر کو سکول سے نکال دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسے شخص کو سائنس ٹیچر مقرر کر دیا جاتا ہے جو سائنس سے کوئی واقفیت نہیں رکھتا۔سکول میں سائنس روم اور سائنس لیب ہونے کے باوجود کیا یہ نااہل سائنس ٹیچر طالب علموں کو صحیح سائنس پڑھا سکے گا؟ ہرگز نہیں!

دوسری طرف وہ قابل اور باصلاحیت سائنس ٹیچر ہے جسے سکول سے بے دخل کر دیا گیا۔ وہ اپنے گھر میں کچھ طالب علموں کو سائنس کی تعلیم دیتا ہے لیکن اس کے پاس لیبارٹری اور تجربہ گاہ نہیں ہیں۔ کیا لیبارٹری اور تجربہ گاہ کے بغیر یہ قابل اور باصلاحیت سائنس ٹیچر ان گنے چنے طالب علموں کو صحیح سائنس پڑھا سکے گا؟ ہرگز نہیں۔ وہ تھیوری تو پڑھا لے گا لیکن لیبارٹری نہ ہونے کی وجہ سے عملی تعلیم نہیں دے سکے گا۔

اب اس مثال کی روشنی میں حدیث ثقلین کا ایک جائزہ لیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث ثقلین میں مسلمانوں کو بتا دیا کہ تمہاری ہدایت اس بات پر موقوف ہے کہ اللہ کی کتاب اور میرے اہل بیت کے ساتھ وابستہ رہنا جو اس کتاب کے حقیقی عالم اور معلم ہیں۔لیکن مسلمانوں نے سازشوں کے ذریعے اہل بیت رسول کو اس منصب سے الگ کر دیا اور ان کی جگہ ایسے افراد کو بٹھا دیا جنہوں نے خود کئی بار یہ اعتراف کیا کہ سب لوگ حتیٰ کہ جاہل بوڑھی عورتیں بھی ان سے زیادہ عالم ہیں۔ ظاہری بات ہے ایسے لوگوں نے امت کو قرآن سے کیا جوڑنا تھا اور قرآنی تعلیمات واحکامات کو معاشرے میں کیسے نافذ کرنا تھا؟ ان کی مثال تو اس نااہل سائنس ٹیچر والی تھی جس کے پاس لیبارٹری، تجربہ گاہ اور سائنس روم تو ہے مگر سائنس کا علم نہیں۔

دوسری طرف اہل بیت رسول تھے جو ہزارہا مشکلات کے ساتھ اپنے گھر میں، گوشہ نشینی کے عالم میں کچھ لوگوں کو قرآنی معارف کی تعلیم دینے میں مصروف تھے لیکن ان کے پاس معاشرے کی تجربہ گاہ نہیں تھی جہاں وہ ان معارف کو عملی طور پر نافذ کر سکتے۔ ان کی مثال اس قابل سائنس ٹیچر کی تھی جو سائنس کا علم تو خوب رکھتا ہے مگر اس کے پاس لیبارٹری نہیں ہے۔ ذرا تصور کریں کہ اگر مسلمان اہل بیت رسول کو اپنا معلم، مربی اور ولی و امام مان کر معاشرے کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں سونپ دیتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے لے کر 40 ہجری تک (خلافت راشدہ کا پورا دورانیہ) امیر المومنین علی ابن ابی

طالب علیہ السلام معاشرے کو قرآن کی تعلیم دیتے اور قرآنی تعلیمات کے مطابق معاشرے کی تشکیل کرتے، ان کے بعد امام حسن علیہ السلام، پھر ان کے بعد امام حسین علیہ السلام اور اسی طرح ان کے بعد دیگر آئمہ علیہم السلام اسی کام کو آگے بڑھاتے تو کیا آج اسلام کی، اسلامی معاشرے کی اور پوری دنیا کی یہ حالت ہوتی جو آج ہے؟ کیا مسلمانوں کے پاس احادیث، تفسیر، فقہ اور عقائد کے علم کی یہی صورت ہوتی جو آج ہے؟ یقیناً نہیں۔

گفتگو کو مزید آگے بڑھانے سے پہلے یہاں امام محمد باقر علیہ السلام کے ایک صحابی اور شاگرد خاص جناب جابر بن یزید جعفی کی ایک روایت نقل کرنا بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے مجھے ستر ہزار احادیث تعلیم فرمائیں جو میں نے کسی سے بیان نہیں کیں۔ کبھی کبھی ان اسرار کی تاب نہ لا کر میں بے چین ہو جاتا تھا۔ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے اس مشکل کو بیان کیا تو آپ نے فرمایا جب ایسی کیفیت ہو تو ایک گڑھا کھود کر اس میں منہ ڈال کر کہہ دیا کرو کہ مجھے امام محمد باقر علیہ السلام نے یہ یہ چیزیں تعلیم کی ہیں۔ (بحارالانوار 46:340)

قارئین محترم توجہ فرمائیں کہ کتاب الکافی جسے شیعہ کتب حدیث میں سب سے برتر مقام حاصل ہے، آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کی کل احادیث کی تعداد سولہ ہزار سے کچھ اوپر ہے۔ جن میں صحیح و ضعیف دونوں طرح کی احادیث پائی جاتی ہیں۔ جابر بن یزید جعفی کو امام محمد باقر علیہ السلام نے ستر ہزار احادیث تعلیم فرمائیں جو کسی اور کو تعلیم نہیں فرمائیں۔ یعنی آٹھ جلدوں پر مشتمل کتاب الکافی سے ساڑھے چار گنا زیادہ۔ یہ احادیث علوم و معارف کے ایسے اسرار و رموز پر مشتمل تھیں جو جناب جابر جعفی کسی اور سے بیان بھی نہیں کر سکتے تھے، اسی لیے کبھی کبھی دل ان اسرار کے بوجھ سے بوجھل ہو جاتا تھا۔ امام علیہ السلام نے اس کا حل یہ بتایا کہ کسی انسان کو بتانے کی بجائے گڑھے میں منہ ڈال کر بوجھ ہلکا کر لیا کرو۔ اب اللہ جانے، امام محمد باقر علیہ السلام جانیں اور جابر بن یزید جعفی جانیں کہ ان احادیث میں کیا کیا اسرار و معارف تھے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جابر بن یزید کے لیے یہ ساری احادیث، صحیح احادیث تھیں اس لیے کہ انہوں نے براہ راست امام علیہ السلام سے سنی تھیں۔

یہاں سے یہ بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ اگر مسلمان حدیث ثقلین پر عمل کرتے اور اسلامی معاشرے کی تعلیم وتربیت اوران کی عقل وفکر کی ترقی ونکھار کا کام اہل بیت رسول کے ہاتھ میں ہوتا تو علوم ومعارف کے کیسے کیسے خزانے مسلمانوں کواور انسانیت کوعطا ہوتے جن کا ایک حصہ جابر بن یزید جعفی کو عطا ہوا۔

ہمیں یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ آج مسلمانوں کے پاس اسلام کے نام پر جو کچھ موجود ہے اس کا اصل اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شاید اتنا ہی تعلق ہے جتنا آج کی یہودیت کا اصل تورات اور موسیٰ علیہ السلام سے اور آج کی مسیحیت کا اصل انجیل اور حضرت مسیح علیہ السلام سے ہے۔اس کے باوجود ہر مسلمان فرقہ اور گروہ اپنے آپ کو اصل اور خالص اسلام سے وابستہ سمجھ رہا ہے۔بعض مداریوں اور بازیگروں نے تو اپنی دکان پر ''اسلام ناب محمدی'' (خالص محمدی اسلام) کا بورڈ بھی لگا رکھا ہے۔خالص محمدی اسلام یعنی اسلام ناب محمدی اگر کسی کے پاس ہے تو صرف اور حضرت حجت علیہ السلام کے پاس ہے اور انہی کے دست مبارک سے اس کرہ ارض پر نافذ ہوگا۔

علامہ نجفی کا غیر ذمہ دارانہ رویہ:

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے اپنی کتاب اقامۃ البرہان علی بطلان التصوف والعرفان میں بہت سے مقامات پر بڑی غیر ذمہ داری سے کام لیا ہے۔ہم ان میں سے چند کی نشاندہی کرتے ہیں:

شہید مطہری کی رائے بیان کرنے میں علامہ نجفی کی غیر ذمہ داری:

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے تصوف کو باطل اور غلط ثابت کرنے کے لیے شہید مرتضیٰ مطہری کے بیان سے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ انہوں نے اس کوشش میں شدید علمی غیر ذمہ داری سے کام لیا ہے۔صفحہ 14 پر شہید مرتضی مطہری کا ایک بیان اس طرح نقل کرتے ہیں:

'' نیز موصوف (یعنی مرتضیٰ مطہری شہید) اقرار کرتے ہیں کہ: بعض اسلامی فقہاء ومحدثین

کا نظریہ ہے ان لوگوں کے خیال میں عرفاء عملی طور پر اسلام کے پابند نہیں ہیں۔قرآن و سنت سے ان کا تمسک صرف عوام فریبی اور مسلمانوں کے دلوں کو اپنی جانب کھینچنے کی غرض سے ہے اور بنیادی طور پر عرفان سے کوئی ربط ہی نہیں رکھتا''۔

شہید مرتضی مطہری کی تحریر کا یہ اقتباس نقل کرنے کے بعد علامہ نجفی صاحب دام ظلہ یہ نتیجہ اخذ فرماتے ہیں:

'' اس سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ تصوف فلاسفہ یونان کے مزعومات، یہودیوں کے نظریات، عیسائیوں کے رہبانیات، ہندوؤں کے خرافات اور جوگیوں کے غیر شرعی ریاضیات کا ایسا غلیظ ملغوبہ ہے کہ نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا''۔

لیکن جب ہم مرتضی مطہری شہید کی اپنی تحریر کی طرف رجوع کرتے ہیں تو صورت حال یکسر مختلف نظر آتی ہے۔شہید مطہری نے صوفیاء کے بارے میں غیر صوفیاء کے تین نظریات بیان کیے ہیں جن میں سے پہلا نظریہ وہی ہے جو علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے اقامۃ البرہان نے نقل کیا ہے۔تینوں نظریات بیان کرنے کے بعد شہید مطہری نے تیسرے نظریے کی تائید کی ہے۔ہم شہید مرتضی مطہری کی فارسی عبارت اور اس کا ترجمہ یہاں پیش کرتے ہیں۔

☆ قهراً اینجا این مسئله طرح می شود که میان آنچه عرفان عرضه میدارند با آنچه اسلام بیان کرده است چه نسبتی بر قرار است۔البته عرفای اسلامی هر گز مدعی نیستند که سخنی ماوراء اسلام دارند و از چنین نسبتی سخت تبری می جویند۔بر عکس، آنها مدعی هستند که حقائق اسلامی را بهتر از دیگران کشف کرده اند و مسلمان واقعی آنها می باشند۔عرفاء، چه در بخش عملی و چه در بخش نظری،همواره به کتاب و سنت و سیره نبوی و آئمه و اکابر صحابه استنادمیکنند۔ولی دیگران در باره آنها نظریه های دیگری دارند و ما به ترتیب آن نظریه ها را ذکر می کنیم:

الف:نظریه گروهی از محدثان و فقهای اسلامی:به عقیده ان گروه عرفا عملا پایبند به اسلام نیستندو استناد آنها به کتاب و سنت صرفا عوامفریبی و برای جلب قلوب مسلمانان است و

عرفان اساسا ربطی به اسلام ندارد۔

ب۔ نظریه گروهی از متجددان عصر حاضر:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ج:نظریه گروه بی طرفها:از نظر این گروه در عرفان و تصوف، خصوصا در عرفان عملی وبالاخص آنجا که جنبه فقهی پیدا می کند، بدعتها و انحرافهای زیاد میتوان یافت که با کتاب اللہ و سنت معتبره وفق نمی دهد۔ ولی عرفاء مانند سایر طبقات فرهنگی اسلامی و مانند غالب فرق اسلامی نسبت به اسلام نهایت خلوص را داشته اندو هرگز نمی خواستند بر ضد اسلام مطلبی گفته و آورده باشند۔ ممکن است اشتباهاتی داشته باشند همچنانکه سایر طبقات فرهنگی مثلا متکلمین، فلاسفه، مفسرین و فقهاء اشتباهاتی داشته اندولی هرگز سوء نیتی درباره اسلام درکار نبوده است۔ مسئله ضدیت عرفاء با اسلام از طرف افرادی مطرح شده است که غرض خاص داشته اندیا با عرفان یا با اسلام۔ اگر کسی بی طرفانه و بی غرضانه کتب عرفاء را مطالعه کند، بشرط آنکه با زبان و اصطلاحات آنها آشنا باشد، اشتباهات زیادی ممکن است بیابد ولی تردید نخواهد کرد که آنها نسبت به اسلام صمیمیت و خلوص کامل داشته اند۔

ما نظر سوم را ترجیح میدهیم و معتقدیم که عرفا سوء نیت نداشتند۔ درعین حال لازم است که افراد متخصص ووارد درعرفان و درمعارف عمیق اسلامی ، بی طرفانه درباره مسائل عرفانی و انطباق آنها با اسلام بحث و تحقیق نمایند۔

(کلیات علوم اسلامی جلد دوم صفحہ 82-84)

ترجمہ:’’یہاں پرلامحالہ یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جو کچھ عرفان کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اسلام کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے؟ البتہ عرفائے اسلام اس بات کے ہرگز دعوے دار نہیں ہیں کہ وہ اسلام سے ہٹ کر کوئی بات کہتے ہیں اور ایسی باتوں کی جونسبت ان کی طرف دی جاتی ہے وہ اس سے سخت اظہار بیزاری

کرتے ہیں۔اس کے برعکس ان کا دعوی یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے حقائق کو دوسروں سے بہتر انداز میں کشف کیا ہے اور حقیقی مسلمان بھی وہی ہیں۔عرفاء عملی اور نظریاتی پہلو میں ہمیشہ کتاب وسنت، سیرت نبوی اور سیرت آئمہ اور اکابر صحابہ کی سیرت سے استدلال کرتے ہیں۔لیکن دوسرے لوگ ان کے بارے میں مختلف آراء رکھتے ہیں اور ہم ان آراء کو ترتیب وار بیان کرتے ہیں:

الف: محدثین اور فقہائے اسلامی کے ایک گروہ کا نظریہ:

اس گروہ کی رائے کے مطابق عرفاء عملاً اسلام کے پابند نہیں ہیں اور کتاب وسنت سے ان کا استناد محض عوام فریبی اور مسلمانوں کے دلوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے لیے ہے اور عرفان کا بنیادی طور پر اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ب: عصر حاضر کے تجدد پسندوں کے ایک گروہ کا نظریہ:

(چونکہ اس نظریے کا ہماری بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے اس کو اور اس کے ترجمہ کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔)

ج: غیر جانبدار گروہ کا نظریہ:

اس گروہ کی رائے کے مطابق عرفان اور تصوف میں، خاص طور پر عملی عرفان میں اور بالاخص فقہی پہلو میں، بہت سی بدعتیں اور انحرافات پائی جاتی ہیں جو کتاب اللہ اور سنت معتبرہ کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی ہیں۔لیکن اسلامی ثقافت کے دوسرے طبقات اور غالب اسلامی فرقوں کی طرح عرفاء بھی اسلام کے بارے میں نہایت خلوص رکھتے تھے اور ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ اسلام کے خلاف کوئی بات کہیں۔اس بات کا امکان ہے کہ ان سے غلطیاں سرزد ہوئی ہوں جیسا کہ متکلمین، فلاسفہ، مفسرین اور فقہاء سے بھی ہوتی ہیں لیکن اسلام کے بارے میں کسی قسم کی بدنیتی کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔عرفاء کی اسلام کے ساتھ مخالفت کا مسئلہ ان لوگوں کی طرف سے اٹھایا گیا ہے جو اسلام یا عرفان کے حوالے سے کوئی خاص نیت رکھتے تھے۔اگر کوئی شخص غیر جانبداری کے ساتھ اور پہلے سے طے شدہ کسی غرض کو پیش نظر رکھے بغیر عرفاء کی کتب کا مطالعہ کرے، بشرطیکہ ان کی زبان اور اصطلاحات سے واقفیت رکھتا ہو تو ممکن ہے کہ اسے بہت سی غلطیاں نظر آئیں

لیکن وہ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کرے گا کہ وہ اسلام کے بارے میں مکمل خلوص رکھتے تھے۔

ہم اس تیسرے نظریہ کو ترجیح دیتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ عرفاء کوئی بد نیتی نہیں رکھتے تھے۔ اس کے باوجود ضروری ہے کہ عرفان اور اسلام کے عمیق معارف میں مہارت رکھنے والے افراد غیر جانبداری کے ساتھ عرفانی مسائل اور اسلام کے ساتھ ان کی مطابقت کے بارے میں بحث وتحقیق کریں''۔

قارئین محترم! یہ ہے شہید مرتضی مطہری کی تحریر اور ان کا نظریہ۔ ان کے یہ الفاظ خاص طور پر قابل توجہ ہیں کہ: ''ہم اس تیسرے نظریہ کو ترجیح دیتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ عرفاء کوئی بد نیتی نہیں رکھتے تھی''۔ اب آپ خود فیصلہ کریں کہ شہید مرتضی مطہری کے اس اقتباس کے کن الفاظ سے یہ واضح وآشکار ہوتا ہے کہ تصوف فلاسفہ یونان کے مزعومات، یہودیوں کے نظریات، عیسائیوں کے رہبانیات، ہندوؤں کے خرافات اور جوگیوں کے غیر شرعی ریاضات کا ایسا غلیظ ملغوبہ ہے کہ نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا؟ اقامۃ البرہان کے مؤلف کی اس علمی ''غیر ذمہ داری'' یا ''غیر امانتداری'' پر ہمیں انتہائی حیرت بھی ہے اور بہت دکھ بھی۔

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے اپنے آخری جملے میں فرمایا کہ: ''تصوف ایسا غلیظ ملغوبہ ہے نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا''۔ علامہ نجفی صاحب کا یہ جملہ اس بات کا واضح اعتراف ہے کہ وہ تصوف کو نہیں سمجھے۔ جب آپ ایک بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے تو اس پر اعتراض اور تنقید کیسی؟ بے سمجھے اعتراض اور تنقید کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے؟

عرفان وتصوف کے بارے میں مرتضیٰ مطہری شہید کے بیان کردہ تیسرے نظریے اور اس نظریے کے بارے میں شہید مرتضیٰ مطہری کے تائیدی بیان کے بعد ہم اس نظریے کے نکات کو ترتیب وار اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

☆ عرفاء عملی اور نظریاتی پہلو میں ہمیشہ کتاب وسنت، سیرت نبوی اور سیرت آئمہ اور اکابر صحابہ کی سیرت سے استدلال کرتے ہیں۔

☆ ہم یقین رکھتے ہیں کہ عرفاء کوئی بد نیتی نہیں رکھتے تھے۔

☆ متکلمین، فلاسفہ، مفسرین اور فقہاء اور دیگر شعبوں کے علماء کی طرح عرفاء اور صوفیاء بھی اسلام کے بارے میں نہایت خلوص رکھتے تھے۔

☆ متکلمین، فلاسفہ، مفسرین اور فقہاء کی طرح عرفاء اور صوفیاء میں بھی غلطیاں پائی جاتی ہیں لیکن جس طرح متکلمین، فلاسفہ، مفسرین اور فقہاء کی غلطیوں کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ انہوں نے یہ غلطیاں جان بوجھ کر بدنیتی کی وجہ سے کی ہیں، اسی طرح عرفاء و صوفیاء کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے جو غلطیاں کی ہیں وہ بدنیتی کی وجہ سے کی ہیں۔

☆ عرفاء کی اسلام کے ساتھ مخالفت کا مسئلہ ان لوگوں کی طرف سے اٹھایا گیا ہے جو اسلام یا عرفان کے حوالے سے کوئی خاص نیت رکھتے تھے۔ یعنی ان کی نیک نیتی مشکوک ہے۔

اس نظریے کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تصوف اور عرفان کو خلاف اسلام اور صوفیاء و عرفاء کو دشمن اسلام کہنا، اسلام اور عرفان دونوں سے ناواقفیت اور تصوف و عرفان کے خلاف اندھے تعصب کی دلیل ہے۔

مرتضیٰ مطہری شہید کا نظریہ نقل کرنے میں علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے جس علمی ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے اسے دیکھ لینے کے بعد ایسی ہی ''ذمہ داری'' کی ایک اور مثال بھی دیکھ لیں۔ انہوں نے اپنی کتاب کے صفحہ 97 پر اصول کافی کا حوالہ دے کر امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث لکھی ہے کہ:

کلما لم یخرج من ھذا البیت فھو زخرف (اصول کافی)

''جو کچھ ہمارے گھر سے ملے اسے حق سمجھ کر لے لو اور جو کچھ ہمارے گھر سے برآمد نہ ہو اسے باطل سمجھ کر چھوڑ دو''۔

مؤلف محترم کو چاہیے تھا کہ صرف اصول کافی کے نام پر اکتفاء کرنے کی بجائے، جلد نمبر اور صفحہ نمبر بھی بیان کرتے۔ اصول کافی میں یہ روایت دیکھنے کے لیے ناچیز نے کمپیوٹر کے ذریعے کئی بار اصول کافی کھنگال ڈالی مگر یہ روایت اصول کافی کہیں میں نظر نہیں آئی۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا

ایسی ہی ایک اور ذمہ داری ملاحظہ فرمائیں۔ علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے اپنی کتاب اقامۃ

البرہان کے صفحہ 49 پر رومی کے چند اشعار لکھ کر تنقید کی ہے جن کا آغاز اس طرح ہوتا ہے: ہر لحظہ بہ شکلی بت عیار در آمد ۔۔۔آگے بریکٹ میں لکھ دیا ہے (مثنوی رومی) جب کہ یہ اشعار مثنوی میں کہیں بھی موجود نہیں ہیں۔ یہ اشعار رومی کی ایک اور کتاب دیوان شمس تبریزی کے بعض غیر مستند نسخوں میں ہیں اور رومی شناس محققین نے جن میں شفیع کدکنی اور بدیع الزمان فروزانفر کے نام نمایاں ہیں، واضح طور پر کہا ہے کہ یہ اشعار رومی کے نہیں ہیں۔ بہر حال اس سے علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کی رومی شناسی کی سطح کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔

علامہ نجفی صاحب کی علمی ذمہ داری کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں: صفحہ 12 پر دو احادیث نبوی نقل کرتے ہیں:

القرآن مع علی و علی مع القرآن

(قرآن علی کے ساتھ ہے اور علی قرآن کے ساتھ ہیں)

انا مدینۃ العلم و علی بابھا

میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔

یہ دونوں احادیث مسلمہ ہیں ان کی صحت میں کوئی شک نہیں۔لیکن جس نکتہ کی طرف ہم متوجہ کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے ان دونوں احادیث کا مکمل حوالہ دینے کی بجائے صرف یہ لکھ دیا کہ (حدیث نبوی متفق علیہ)۔ اہل علم حضرات جانتے ہیں کہ "متفق علیہ" علم الحدیث کی ایک اصطلاح ہے اور اس سے مراد وہ حدیث ہوتی ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں پائی جاتی ہو۔ جب کہ یہ دونوں احادیث بخاری اور مسلم دونوں میں تو دور کی بات، ان دونوں میں سے کسی ایک میں بھی نہیں پائی جاتی ہیں۔ اگر علامہ نجفی صاحب دام ظلہ "متفق علیہ" کے صحیح معنی جانتے ہیں اور پھر انہوں نے یہ بات کی ہے تو یہ صریحاً جھوٹ اور خلافِ امانت ہے۔ اور اگر وہ متفق علیہ کی اصطلاح کے معنی سے ہی واقف نہیں ہیں تو پھر انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بلکہ دونوں صورتوں میں انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اقامۃ البرہان میں علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کی ایسی علمی ذمہ داریوں کے اور بھی نمونے موجود

ہیں لیکن ہم سب کی نشاندہی نہیں کرنا چاہتے۔ جو کچھ ہم ثابت کرنا چاہ رہے ہیں وہ انہی مثالوں سے ثابت اور واضح ہوجاتا ہے۔

تصوف اور صوفیاء کا آغاز:

تیسرے باب میں علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے فرقہ صوفیہ کے آغاز کے بارے میں گفتگو فرمائی ہے۔ اپنی کتاب کے صفحہ 38 پر اس بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ حقیقت ہے، اس میں کسی قسم کے شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ فرقہ ضالہ مضلہ صوفیہ عہد بنی امیہ کی پیداوار ہے اور اس کی ایجاد کا سہرا امراء وملوک بنی امیہ کے سر پر ہے۔ اس داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم کی وفات حسرت آیات کے بعد یار لوگوں نے بڑے لطائف الحیل سے خاندان نبوت سے ظاہری اقتدار تو چھین لیا، لہٰذا اب اس خانوادۂ عصمت وطہارت کے پاس مادی اسباب ووسائل تو تھے نہیں کہ عامۃ الناس اور ابناء الدنیا قسم کے لوگ ان کے پاس آتے جاتے، ان کے پاس روحانی کمالات اور معجزات وکرامات ضرور تھے۔ جن کی وجہ سے لوگ ان کی طرف جھکتے تھے اور ان کے در دولت پر حاضر ہوتے تھے۔ لہٰذا بنی امیہ کے دور میں بڑی گہری سوچ بچار کے بعد اہل بیت نبوت کے روحانی اقتدار پر شب خون مارنے کے لیے بظاہر تارک دنیا اور بباطن سگ دنیا قسم کا ایک صوف پوش گروہ تیار کیا گیا اور اسے حکومتی سرپرستی سے نوازا گیا اور پھر اس گروہ کے خود ساختہ کشوف وکرامات کی بڑے پیمانے پر تشہیر کی گئی تاکہ عامۃ الناس کو آل محمد کے دروازہ سے ہٹایا جائے اور ان لوگوں کے دروازہ پر جھکایا جائے''۔

(انوار نعمانیہ از علامہ جزائری)

یہاں ایک جملہ معترضہ کے طور پر مومنین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ انوار نعمانیہ میں جہاں بہت سی اچھی باتیں موجود ہیں وہاں اس میں خرافات کی بھی بھرمار ہے۔ بعض علاقوں میں عید شجاع کے نام پر جو خرافات انجام دی جاتی ہیں ان کی سند جواز بھی اس کتاب میں موجود ہے۔

قارئین محترم! آپ نے یہ بیان ملاحظہ فرمایا۔ مؤلف محترم نے اس بیان کا آغاز اس جملے سے کیا ہے کہ: ''یہ حقیقت ہے، اس میں کسی قسم کے شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔۔۔۔''

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بیان صرف اور صرف ایک دعویٰ ہے جس کے ثبوت میں ایک بھی دلیل پیش نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی کی جاسکتی ہے۔ عدل وانصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ بنی امیہ کے تیار کردہ صوف پوش گروہ کے سرکردہ افراد کے نام بتائے جاتے، ان کی حکومتی سرپرستی کی کچھ مثالیں پیش کی جاتیں، اہل بیت سے ان کی دشمنی کے قطعی اور ناقابل تردید شواہد پیش کیے جاتے اور ان کے خودساختہ کشوف وکرامات اور ان کی بڑے پیمانے پر تشہیر کے کچھ نمونے بیان کیے جاتے۔ دعووں اور الزامات کی ایک فہرست تو پیش کردی گئی لیکن ثبوت کسی بات کا نہیں۔ یہ اہل تحقیق کا شیوہ نہیں ہے۔

مولف محترم نے اس بات پر بھی تاکید کی ہے کہ پہلی صدی میں صوفیاء کا کوئی گروہ نہیں تھا اور یہ دوسری صدی میں منظر عام پر آئے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے حقیقت یہ ہے کہ دوسری صدی کے آغاز سے بنی امیہ کے اقتدار کا زوال شروع ہوگیا تھا جو رفتہ رفتہ 132 ہجری میں مکمل ہوگیا۔ 132 میں بنوعباس نے عنان خلافت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ پہلی صدی جو بنوامیہ کے اقتدار کی صدی تھی اس میں بنوامیہ کے بنائے گئے اس گروہ کا وجود نہیں ہے اور دوسری صدی جس کی پہلی تہائی تک ہی وہ برسر اقتدار رہے اور وہ بھی کمزور اور روبہ زوال حالت میں، اس میں یہ گروہ سامنے آجاتا ہے، اور اس کی حکومتی سرپرستی بھی ہورہی ہوتی ہے اور حکومتی مشینری اس کے خودساختہ کشوف وکرامات کی تشہیر بھی کررہی ہے۔

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے اپنی کتاب کے صفحہ 46 پر حضرت ابوذر غفاری کی یہ روایت درج کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یا ابا ذر یکون فی آخر الزمان قوم یلبسون الصوف فی صیفھم و شتائھم یرون ان لھم الفضل بذالک علی غیرھم اولٓئک یلعنھم ملائکۃ السماوات و الارض۔

ترجمہ: اے ابوذر! آخری زمانہ میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوگی جو گرمیوں اور سردیوں میں صوف کا لباس پہنے گی اور یہ خیال کرے گی کہ اسے اس وجہ سے باقی لوگوں پر فضیلت حاصل ہے۔ اس جماعت پر آسمان اور زمین کے فرشتے لعنت کرتے ہیں۔ (حدیقۃ الشیعہ، عین الحیاۃ، سفینۃ البحار وغیرہ)

قارئین محترم! آیئے اس روایت کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس روایت کے مطابق:

(1) جماعت صوفیہ آخری زمانے میں پیدا ہوگی۔

(2) یہ جماعت گرمیوں اور سردیوں میں صوف (اون) کا لباس پہنے گی۔

(3) یہ جماعت صوف کا لباس پہننے کی وجہ سے خود کو دوسرے لوگوں سے افضل سمجھے گی۔

اب ایک ایک کر کے ان تین باتوں کا تجزیہ کرتے ہیں:

(1) جماعت صوفیہ آخری زمانے میں پیدا ہوگی۔

قارئین محترم! غور فرمائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ حیات کے لحاظ سے آخری زمانہ کونسا ہوگا؟ ظاہر سی بات ہے قرب قیامت کا زمانہ ہوگا یا ظہور حضرت مہدی علیہ السلام کے قرب کا زمانہ ہوگا۔ اسی وجہ سے انہیں مہدی آخر الزمان بھی کہا جاتا ہے۔ بنو امیہ کے دور حکومت کو جو 132 ہجری میں ختم ہو گیا، کسی لحاظ سے آخری زمانہ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کی یہ بات مان لی جائے کہ یہ جماعت بنو امیہ کے دور میں خود ان کے ہاتھوں وجود میں آئی (یا دوسری صدی میں وجود میں آئی) تو آخری زمانے میں اس جماعت کے وجود میں آنے والی بات واضح طور پر غلط قرار پائے گی۔ اس کے برعکس اگر یہ جماعت آخری زمانے میں پیدا ہوگی تو بنو امیہ کے دور حکومت میں اس جماعت کے پیدا ہونے والی بات غلط ہوگی۔ ان دونوں باتوں کا تضاد روز روشن کی طرح واضح ہے۔ جماعت صوفیہ بہر حال آخری زمانے سے بہت پہلے وجود میں آ چکی ہے لہٰذا اس کے آخری زمانے میں پیدا ہونے والی بات یقیناً غلط ہے۔ چونکہ یہ ممکن نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات جھوٹ اور غلط ہو لہٰذا ہم بلا خوف تردید کہتے ہیں کہ یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب ابوذر سے نہیں کہی، یہ کسی کذاب کا گھڑا ہوا جھوٹ اور کسی مفتری کا افتراء ہے۔ یہ روایت سو فیصد جھوٹی روایت ہے۔

(2) یہ جماعت گرمیوں اور سردیوں میں صوف (اون) کا لباس پہنے گی۔

زمینی حقائق کو دیکھا جائے تو یہ بات بھی بالکل غلط ہے کہ صوفیاء گرمیوں اور سرویوں میں صوف کا لباس پہنتے ہیں۔ صوفیاء میں سے چند انگشت شمار افراد ہی ایسے ملیں گے جو ہر موسم میں صوف کا لباس پہنتے ہوں ورنہ صوف کا لباس پہننا ان کا عمومی معمول کبھی نہیں رہا۔ دور حاضر کے اہل تصوف کو ہی دیکھ لیں:

ہمارے ملک میں واصف علی واصف،صوفی برکت علی،شمس الدین عظیمی،ڈاکٹر طاہر القادری کو دیکھ لیں۔ان میں سے کون صوف کے لباس میں ملبوس نظر آتا ہے؟ مؤلف نے عرفان اور تصوف کو ایک قرار دے کر شیعہ عرفاء کو بھی صوفی قرار دے دیا اور کسی کو اس سے انکار بھی نہیں ہے کہ عرفان اور تصوف حقیقت میں ایک ہی ہیں۔معاصر شیعہ عرفاء میں آیت اللہ خمینی،آیت اللہ تقی بہجت،آیت اللہ علامہ سید محمد حسین طباطبائی،آیت اللہ علامہ سید محمد حسین حسینی تہرانی، حجۃ الاسلام حسین انصاریان،آیت اللہ حسین مظاہری،آیت اللہ عبداللہ جوادی آملی،آیت اللہ مرتضیٰ مطہری،آیت اللہ علامہ حسن مصطفوی،آیت اللہ محمد تقی جعفری اور آیت اللہ صادقی تہرانی 1 کا شمار عرفاء میں ہوتا ہے۔ ان میں سے کون گرمیوں اور سردیوں میں صوف (اون) کا لباس پہنتا تھا؟اس حقیقت میں کسی قسم کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ صوف کا لباس پہننا کبھی بھی صوفیاء کا عمومی معمول نہیں رہا۔لہٰذا مذکورہ روایت کی یہ بات بھی زمینی حقائق کے بالکل خلاف ہے کہ صوفیاء گرمیوں اور سردیوں میں صوف کا لباس پہنا کریں گے۔یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد نہیں فرمائی۔اس لیے کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی ایسی پیشینگوئی فرمائیں جو زمینی حقائق کے کے بالکل برعکس ہو۔

---

1 آیت اللہ العظمیٰ ڈاکٹر محمد صادقی تہرانی رضوان اللہ علیہ کی عرفانی روش بھی عام عرفاء سے مختلف تھی،جس طرح فقہ وفلسفہ میں ان کی روش عام فقہاء وفلاسفہ سے مختلف تھی۔وہ فقہ،فلسفہ،عرفان اور دیگر تمام علوم میں اصالۃ القرآن کے قائل تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ تمام اسلامی علوم میں بنیادی اور مرکزی حیثیت قرآن مجید کو حاصل ہے۔وہ تمام اسلامی علوم میں قرآن مجید کی بنیاد پر اصلاح کے علم بردار تھے۔لہٰذا ان کی تحریروں میں اگر روایتی تصوف وعرفان کی رد میں مطالب ملتے ہیں تو ایسے ہی ان کے بیانات فقہ وفلسفہ وکلام کے بارے میں بھی موجود ہیں۔ان کی تفسیر موضوعی میں ایک جلد عرفان کے موضوع پر ہے اور دو جلدیں اللہ کے موضوع پر ہیں جن میں معرفت وعرفان کو قرآن اور تعلیمات اہل بیت کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔جزاہ اللہ خیر الجزاء

(3) یہ جماعت صوف کا لباس پہننے کی وجہ سے خود کو دوسرے لوگوں سے افضل سمجھے گی۔

جب یہ طے ہو گیا کہ صوف کا لباس پہننا جماعت صوفیہ کا شعار اور خصوصیت ہی نہیں ہے تو یہ بات بھی بے بنیاد ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ صوف پہننے کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور افضل سمجھیں گے۔علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کوئی ایک مثال دکھا دیں کہ صوفیاء نے صرف صوف کا لباس پہننے کی وجہ سے خود کو دوسروں سے افضل اور برتر سمجھا ہو یا اپنی کسی کتاب میں لکھا ہو کہ چونکہ ہم صوف کا لباس پہنتے ہیں لہٰذا صوف کا لباس پہننے کی وجہ سے ہم ان سب لوگوں سے افضل اور برتر ہیں جو صوف کا لباس نہیں پہنتے۔تصوف کی تعلیمات اور حقیقی صوفیاء کی ایک نمایاں خصوصیت تواضع اور انکساری ہے۔اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنے کی بیماری کو عرفان و تصوف میں انتہائی ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔البتہ یہ بیماری ظاہر پرست مولوی صاحبان میں ضرور پائی جاتی ہے اور کوٹ کوٹ کر پائی جاتی ہے کہ عبا قبا عمامہ پہنتے ہی ان کے دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو محض اس لباس کی وجہ سے دوسروں سے برتر سمجھنے لگ جاتے ہیں اور دوسروں کو ''عوام کالانعام'' کہنے لگتے ہیں جس کے معنی ہیں: ''عوام جانوروں کی مانند ہیں''۔

اس طرح یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس روایت میں بیان شدہ تیسری بات کا بھی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ بات صادق و امین رسول نے ہرگز نہیں فرمائی ہے۔

مذکورہ بالا تجزیہ سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ روایت جعلی ہے اور زمین و آسمان کے فرشتوں کی لعنت ان پر ہوتی ہے جنہوں نے یہ جھوٹی حدیث گھڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کر دی۔افسوس ناک بات یہ ہے کہ عقل و درایت کے پیمانے پر پرکھے بغیر اس جھوٹی اور جعلی حدیث کو قبول کر لیا گیا ہے اور زور و شور سے بیان بھی کیا جاتا ہے۔

صوفیاء اور تصوف کے بارے میں ایک عجیب ستم ظریفی:

صوفیاء اور تصوف کے بارے میں کی جانے والی ایک عجیب ستم ظریفی یہ بھی ہے کہ ان کے ہر مخالف نے انہیں اپنے بدترین مخالفین کا پیدا کردہ گروہ قرار دیا۔علامہ نجفی صاحب دام ظلہ اور ان کے ہم

مشرب افرادتصوف اور جماعت صوفیاء کو بنی امیہ کی پیداوارقرار دیتے ہیں جوانہوں نے آل محمد کا مقابلہ کرنے کے لیے اور ان کے روحانی اقتدار پر شب خون مارنے کے لیے پیدا کی۔اس کے برعکس وہابی حضرات کی طرف سے صوفیاء اورتصوف کی مخالفت میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ گروہ شیعوں کا پیدا کردہ ہے جو انہوں نے اسلام کونقصان پہنچانے کے لیے پیدا کیا۔احسان الٰہی ظہیر پاکستان کے معروف اہل حدیث عالم تھے۔انہوں نے اپنی کتاب ''تصوف : تاریخ وحقائق'' میں تیسرا باب ہی اس عنوان سے قائم کیا ہے: شیعیت اورتصوف۔اس باب کا آغاز وہ اس جملے سے کرتے ہیں :

''شیعیت دراصل یہودیت کا چربہ ہے،شیعیت کے موجد اور بانی یہودی ہیں''۔آگے چل کر وہ کہتے ہیں:''یہودیوں نے شیعہ ازم کے ذریعے بہت سے فرقوں کی پرورش کی،تاہم ان تمام فرقوں کو پرکھنے کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کی بنیاد شیعہ ازم ہے۔

یہی حال تصوف کا ہے۔اسلامی تاریخ کے اندر وہ پہلے تین افراد جوصوفی کے لقب سے مشہور ہوئے وہ تینوں شیعہ تھے اوران مقامات پررہائش پذیر تھے جواس دور میں شیعیت کے مراکز تھے،یعنی کوفہ۔

ان تینوں میں سے ایک ابو ہاشم کوفی ہے جس کے بارے میں کچھ باتیں تو ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں،یہ کوفہ کے مشہور شیعوں میں سے تھا بلکہ اس کے بارے میں تو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ دہریہ اور زندیق تھا۔(احسان الٰہی ظہیر کی جہالت اوراندھے پن کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک طرف سے ابوہاشم کوفی کوشیعہ کہہ رہیں اوردوسری طرف سے اسے دہریہ اورزندیق۔اس کے معنی یہ ہوئے کہ انہیں شیعہ کی پہچان ہے نہ دہریہ اورزندیق کی۔)

دوسرا شخص جابر بن حیان ہے۔۔۔۔ یہ کیمیا دان اورکوفہ کا مشہور شیعہ ہے،تصوف میں اس کا خاص مقام ہے۔

تصوف کے بانیوں میں سے تیسرا شخص عبدک ہے ۔۔۔۔شیعہ محقق ڈاکٹر قاسم غنی اورعراق کے شیعہ محقق ڈاکٹر مصطفی الشیبی وغیرہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہےاوراس امر کی تصدیق کی ہے کہ وہ غالی شیعہ تھا''۔

احسان الٰہی ظہیراس کتاب کےصفحہ 191 پر''تصوف کے سلسلے'' کے تحت لکھتے ہیں:

'' تصوف کی بنیاد شیعیت ہےاوراس کی ایک دلیل یہ ہے کہ تصوف کے سارے سلسلے سوائے ایک

دو کے سبھی حضرت علی ابن ابی طالب پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔کسی اور صحابی کی طرف ان سلسلوں کی اسناد نہیں ہے۔ان تمام سلسلوں کی اسناد کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس میں شیعوں کے معصوم آئمہ کا ذکر ملتا ہے اور شیعوں کا ان کے بارے میں عقیدہ یہ ہے کہ وہ حضرت علی کی اولاد میں سے تھے۔تصوف کی کتابوں میں بھی ان آئمہ معصومین کا ذکر ملتا ہے ۔اس کے علاوہ تصوف کا ذکر حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ہی شروع کیا جاتا ہے''۔

احسان الٰہی ظہیر اس باب کا اختتام اس طرح سے کرتے ہیں:

''آخر میں ہم ایک اور مستشرق براؤن کا ایک جملہ نقل کرنا چاہیں گے جو میرے خیال میں اس پورے موضوع اور کتاب کا خلاصہ ہے۔ براؤن کہتا ہے:''شیعیت اور صوفیت ایرانیوں کے دو ہتھیار تھے جس کے ذریعے انہوں نے عرب کا مقابلہ کیا۔''

عرفان و تصوف کی اصل:

اپنی کتاب کے صفحہ 38 پر علامہ نجفی صاحب دام ظلہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ تصوف تمام سابقہ ادیان عالم میں موجود رہا ہے۔ان کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

''اگرچہ تصوف کسی نہ کسی شکل میں سابقہ ادیان عالم یہودیت ،نصرانیت اور ہندوازم میں بھی رہا ہے مگر ہمارا مدعا یہ ہے کہ یہ اسلام میں کب اور کس طرح داخل ہوا''۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ گزشتہ تمام ادیان عالم میں تصوف کہاں سے آیا؟ کیا ان ادیان میں بھی بنوامیہ نے محمد وآل محمد کے خلاف سازش کر کے اور ان کے روحانی اقتدار پر شب خون مارنے کے لیے تصوف کو ان ادیان میں داخل کیا تھا؟ کیا ایک محقق عالم کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اس سوال پر غور کرے کہ اسلام سے پہلے کے تمام ادیان عالم میں تصوف کہاں سے آیا؟ اس لیے کہ تمام ادیان میں تصوف کا موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ تصوف کا ہر دین و مذہب سے کوئی فطری تعلق ہے۔کیا اس تعلق کو جاننا ضروری نہیں؟ اس بات کو کیوں نظر انداز کیا جائے کہ جن اسباب و وجوہات کی بنا پر تصوف تمام سابقہ ادیان میں داخل ہوا عین ممکن ہے انہی اسباب کی بنیاد پر تصوف اسلام میں بھی داخل ہوا ہو۔تصوف کا ہر دین و مذہب کے ساتھ ایک فطری تعلق ہے۔اس فطری تعلق کا کھوج لگانے کی بجائے یہ کہنا کہ اسلام میں تصوف کی ایجاد بنوامیہ کے ہاتھوں ہوئی ،کوئی عالمانہ اور عادلانہ بات نہیں ہوگی۔اس بنیادی سوال کو نظر انداز کر

کے یہ کہنا کہ تصوف بنوامیہ کی پیداوار ہے بالکل ایسا ہی جیسے بعض بے انصاف لوگ کہتے ہیں کہ مذہب شیعہ عبداللہ ابن سبا کا پیدا کردہ ہے۔ہم یہاں اختصار سے اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ تصوف کا ہر دین میں داخلہ کیونکر ہوا اور تصوف کا ہر دین سے کیا تعلق ہے؟

دنیا کے سب ادیان انسان کو کچھ حقائق پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں اور عملی زندگی کے لیے کچھ ہدایات وقوانین دیتے ہیں اور اس بات کا دعوی کرتے ہیں کہ ان عقائد کی بنیاد پر اور ان قوانین و ہدایات کی روشنی میں زندگی گزارنے سے انسان اللہ کے قرب کی منزل پا لیتا ہے۔اس کے اندر تقویٰ اور روحانی پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے،اسے اللہ کے ذکر میں اور عبادت میں روحانی لذت محسوس ہوتی ہے۔شیطان اس سے دور ہوجاتا ہے،اس کی زندگی شیطانی اعمال وافکار سے پاک ہوجاتی ہے اور وہ ایک الٰہی انسان بن جاتا ہے۔

لیکن عملی طور پر دیکھا گیا ہے کہ بنیادی عقائد پر ایمان رکھتے ہوئے تمام اعمال وعبادات کو انجام دینے کے باوجود یہ سب روحانی آثار انسان کی زندگی میں پیدا نہیں ہوتے جو پیدا ہونے چاہیئیں۔آخر کیوں؟ دیگرادیان ومذاہب سے قطع نظر ہم اپنی یعنی مسلمانوں کی حالت پر نظر ڈال لیتے ہیں۔ہم کہتے ہیں نماز بے حیائی اور بدکاری سے روکتی ہے،ساتھ ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ ساری زندگی نمازیں پڑھتے گزر جاتی ہے اور فحشاء ومنکرات کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔کیوں؟اس کی وجہ علامہ اقبال نے اس طرح بیان کردی ہے:

صفیں کج،دل پریشاں،سجدہ بے ذوق　　　　کہ جذب اندروں باقی نہیں

یا ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

تیری نماز بے سرور،تیرا امام بے حضور　　　　ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر

ہم کہتے ہیں کہ روزہ رکھنے سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔بہت سے انسان بالغ ہونے کی عمر سے پابندی کے ساتھ ہر سال روزے رکھتے ہیں۔لیکن پچاس سال کی عمر میں بھی تقویٰ کی وہی حالت ہوتی ہے جو پندرہ سال کی عمر میں تھی۔ایسے ہی لوگوں کے بارے میں مولا علی (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بہت سے

روزہ دار ایسے ہوتے ہیں جنہیں ان کے روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ قرآن متقین کے لیے ہدایت ہے۔ ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ جس نے 10 سال کی عمر میں ناظرہ قرآن شریف پڑھ لیا اور اب ترجمہ کے ساتھ بھی قرآن پڑھتا ہے، ہر سال رمضان المبارک میں قرآن ختم کرتا ہے، لیکن اس کا اس کی زندگی پر کوئی اثر نظر نہیں آتا۔1ے

دنیاوی لحاظ سے انسان جو بھی کام شروع کرتا ہے بیس پچیس سال کے بعد وہ اس کام میں بہت ترقی کر جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک نوجوان پندرہ سال کی عمر میں کوئی بھی کام شروع کرتا ہے۔ اس وقت اسے اس کا کچھ علم اور تجربہ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر وہ اس کام کو جاری رکھے تو چالیس سال کی عمر میں اپنے کام کا ماہر بن جاتا ہے۔ اسے اپنے کام کی ہر اونچ نیچ کا علم ہو جاتا ہے۔ اگر پچیس سال کی عمر میں ایک نوجوان ایم بی بی ایس کر کے بطور ڈاکٹر کام شروع کر دے تو پچیس سال کے بعد ایک ماہر ڈاکٹر بن جاتا ہے۔

لیکن دینی معاملات میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ دس سال کی عمر میں نماز پڑھنی شروع کی۔ پھر پابندی سے نماز پڑھتے رہے۔ پچاس سال کی عمر میں بھی نماز کی وہی کیفیت ہوتی ہے جو دس سال کی عمر میں ہوتی ہے۔ دس سال کی عمر میں بھی نماز کے دوران دل اور دماغ ادھر ادھر بھٹکتے رہتے تھے، پچاس سال کی عمر میں بھی نماز کی وہی کیفیت ہوتی ہے۔ یہی حالت دیگر تمام اعمال کی بھی ہوتی ہے۔ دس سال کی عمر سے پابندی سے روزے رکھنے شروع کیے، لیکن پچاس سال کی عمر میں بھی روزے کی کیفیت وہیں کھڑی نظر آتی ہے جہاں دس سال کی عمر میں تھی، یعنی بقول امیر المومنین علیہ السلام، روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

اگر کوئی انسان اپنے بچے کو اچھی جسمانی خوراک فراہم کر رہا ہو لیکن بچے کا وزن بھی نہ بڑھ رہا

1ے ایک بار ایک سماجی تنظیم کے ارکان کے ہمراہ لاہور کے کوٹ لکھپت جیل کا دورہ کرنے کا موقع ملا۔ وہاں کے مختلف سیکشن دیکھے۔ ایک جگہ قیدیوں کو حفظ قرآن کی تعلیم دی جا رہی تھی۔ اس شعبے کے انچارج حافظ صاحب جو قیدیوں کو قرآن حفظ کروا رہے تھے وہ بھی ایک قیدی تھے۔ جب ان سے پوچھا کہ آپ کس جرم میں قید کی سزا کاٹ رہے ہیں تو انہوں شرمندگی سے سر جھکا کر کہا: حدود کیس۔

ہواور خوراک کے اثرات ظاہر نہ ہور ہے ہوں تو ماں باپ پریشان ہوجاتے ہیں کہ ہمارے بچے کو خوراک کیوں نہیں لگ رہی۔ وہ ڈاکٹروں کے پاس جاتے ہیں اور معلوم کرتے ہیں کہ خوراک بچے کو کیوں نہیں لگ رہی۔

لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ چالیس چالیس سال کی عبادت کے اثرات ہماری زندگی میں ظاہر نہیں ہوتے۔ پچاس سال کی عمر میں بھی نماز، روزہ، تلاوت، حج، عمرہ، زیارات وعبادات کے باوجود روحانی طور پر ہم وہیں کھڑے ہوتے ہیں جہاں دس سال کی عمر میں تھے۔ یا اگر کوئی فرق پڑتا بھی ہے تو بہت کم، اتنا نہیں جتنا ہونا چاہیے۔ لیکن نہ ہمیں کوئی پریشانی ہوتی ہے اور نہ ہم یہ سوچنے کی زحمت کرتے ہیں کہ ہماری عبادات کا اثر کیوں نہیں ہورہا؟

مولانا رومی اس بات کو مثنوی میں بہت ہی خوبصورت پیرائے میں بیان فرماتے ہیں۔ اپنے اسلوب کے مطابق پہلے وہ ایک حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک بھکاری ہر روز بھیک مانگنے نکلتا ہے، لوگ اسے بھیک میں گندم دیتے ہیں۔ رات کو وہ اپنے گھر آکر گندم کو انبار یعنی گودام میں ڈال دیتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ سمجھتا ہے کہ اب کافی گندم جمع ہوگئی ہوگی، اسے بازار میں جاکر بیچ دینا چاہیے۔ لیکن جب وہ انبار میں جاکر دیکھتا ہے تو اس میں گندم بہت کم ہوتی ہے۔ وہ پریشان ہوجاتا ہے کہ گندم کہاں گئی؟ کچھ دن گزرنے کے بعد پھر سوچتا ہے کہ اب کافی گندم جمع ہوگئی ہوگی۔ لیکن جب انبار کو دیکھتا ہے تو اس میں بہت کم گندم ہوتی ہے۔ آخر وہ یہ سوچنے لگ جاتا ہے کہ میں روز اچھی خاصی گندم لاکر اس انبار میں ڈالتا ہوں، آخر گندم جاتی کہاں ہے؟ وہ انبار کی رکھوالی شروع کردیتا ہے۔ جب رکھوالی شروع کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ایک بڑا سا چوہا آتا ہے اور ایک طرف سے جو سوراخ اس نے انبار میں بنایا ہوتا ہے اس سے انبار میں داخل ہوجاتا ہے اور گندم کھانی شروع کردیتا ہے۔ چنانچہ وہ شخص اس چوہے کو مارتا ہے، انبار کے سوراخ کو ٹھیک کرتا ہے اور چوہے کی دراندازی کے راستے بند کردیتا ہے اور اس طرح اس کی گندم چوہے سے محفوظ ہوجاتی ہے۔

رومی کہتے ہیں کہ ہم سالہا سال عبادت کی گندم جمع کرتے رہتے ہیں، لیکن نفس امارہ جو چوہے کی طرح سرگرم رہتا ہے، ہماری اس گندم کو کھاتا رہتا ہے۔ چالیس سال اعمال وعبادات کے بعد بھی دیکھتے ہیں کہ ہماری زندگی میں ان عمال کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لیے پہلے نفس امارہ کے چوہے کا بندوبست کرو پھر

اعمال صالح کی گندم جمع کرو۔

ما در این انبار گندم می کنیم	گندم جمع آمده گم می کنیم
می نیندیشیم آخر ما بہ ہوش	کین خلل در گندم است از مکر موش
موش تا انبار ما حفرہ زدہ است	وز فنش انبار ما ویران شدہ است
اول ای جان دفع شر موش کن	وانگہ اندر جمع گندم جوش کن
بشنو از اخبار آن صدر الصدور	**لا صلوٰۃ تم الا بالحضور**
گر نہ موش دزد در انبار ماست	گندم اعمال چل سالہ کجاست

ترجمہ: ہم اپنے انبار یعنی گودام میں گندم جمع کرتے ہیں،
لیکن جمع کی ہوئی گندم کھو دیتے ہیں۔
ہم عقل و ہوش سے کام لے کر یہ نہیں سوچتے کہ
گندم کا نقصان اور خلل چوہے کے مکر کی وجہ سے ہے۔
نفس امارہ کا چوہا راستہ بنا کر ہمارے انبار میں آیا ہوا ہے،
اس کے اس فن کی وجہ سے ہمارا انبار ویران ہو چکا ہے۔
اے میری جان پہلے چوہے کے شر کو دفع کرنے کی تدبیر کرو
پھر اس کے بعد جوش و جذبے سے گندم جمع کرو۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو سب سرداروں کے سردار ہیں
ان کا یہ فرمان سنو کہ حضور قلب کے بغیر نماز مکمل نہیں ہوتی۔
اور یہ بات یاد رکھو کہ اگر یہ چور چوہا ہمارے انبار میں نہیں ہے
تو پھر چالیس سال کے اعمال کی گندم کہاں ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اپنے ایمان و اعمال کے انبار میں نفس امارہ کے چوہے کی

دراندازی روکنے کا بندوبست کرنے اورعبادات کے ذریعے روحانی ترقی ،تقویٰ اورقرب خدا حاصل کرنے کا نام ہے تصوف۔

تمام ادیان و مذاہب میں تصوف اورعرفان کی ایک اوراہم وجہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ انسان نے جب سے آنکھ کھول کر کائنات کا مشاہدہ شروع کیا تو اس کے سامنے دوسوال آئے۔ایک یہ کہ کائنات کے مختلف مظاہر کن قوانین کے تحت کام کر رہے؟ (بارش کیسے ہوتی ہے؟ طوفان اور زلزلے کیسے آتے ہیں؟ سورج چاند ستارے کن قوانین کے تحت اپنی حرکت اور گردش میں مصروف ہیں اوراس گردش کے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔)اس سوال کا جواب انسان کوسائنس کی طرف لے گیا۔ دوسرا سوال یہ کہ یہ کائنات کہاں سے آئی ہے اوراس مادی کائنات کا اپنے خالق کے ساتھ تعلق کس نوعیت کا ہے، کائنات کا ایک جزوہونے کی حیثیت سے ہمارا کائنات اوراپنے خالق کے ساتھ اصل تعلق کیا ہے؟ اس سوال کا جواب انسان کوعرفان کی طرف لے گیا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس سوال کا جواب عرفان کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔قرآنی آیات اور معصومین علیہم السلام کی احادیث اوردعائیں اس بات پر واضح دلالت کرتی ہیں۔

تمام مذاہب میں تصوف کی اس بنیادی وجہ کونظر انداز کر کے یہ کہنا کہ اسلام میں تصوف کی پیدائش کا سہرا ملوک بنی امیہ کے سر ہے،سراسر بے علمی اور بے انصافی ہے۔

آئمہ معصومین کی دعائیں:

آئمہ معصومین کی تعلیمات اوردعاؤں کی روشنی میں اللہ تعالیٰ اور کائنات کے ربط اورتعلق کے حوالے سے غور وفکر کریں تو ہمیں عرفانی نکات بہت واضح طور پر نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر دعائے کمیل کے اس جملے میں غور فرمائیں:

وباسمائک التی ملاءت ارکان کل شیء

ترجمہ: اور یا اللہ تیرے ناموں کے وسیلے سے تجھ سے دعا مانگتا ہوں جنھوں نے کائنات کی ہر چیز کے ارکان کو پر کیا ہوا ہے۔

یہ جملہ واضح طور پر بتا رہا ہے کہ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی، مادی اور غیر مادی چیز کے ارکان اور بنیادیں اللہ کے ناموں سے بھری ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ سورج کو دیکھیں یا ذرے کو، درخت کو دیکھیں یا پتے کو، انسان کو دیکھیں یا چیونٹی کو، یا اس سے بھی چھوٹے خوردبینی اجسام کو، غرض یہ کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے اسماء سے بھری ہوئی ہے۔ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے اسماء سے بھری ہوئی نہ ہو۔

دوسری اہم بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء، یعنی اس کی صفات زائد بر ذات نہیں بلکہ عین ذات ہیں۔ دعائے کمیل کے اس جملے کی روشنی میں کائنات کی عرفانی تصویر کچھ اس طرح سے بنتی ہے کہ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی اور مادی و غیر مادی چیز اللہ کے اسماء سے بھری ہوئی ہے اور اللہ کے اسماء بھی عین ذات ہیں۔ قرآن مجید میں اسی بات کو ایک اور رخ سے بیان کیا گیا ہے:

اَلَا اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْط

ترجمہ: خبردار وہ (اللہ) ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔ (فصلت: 54)

اب پھر ذرے سے سورج اور سورج سے کہکشانوں تک، سمندر سے قطرے تک، انسان سے لے کر چیونٹی اور خوردبینی جراثیموں تک، اللہ تعالیٰ ہر چیز محیط ہے۔ کسی ایسی چیز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جس پر اللہ تعالیٰ محیط نہ ہو۔ پس اللہ تعالیٰ ہر چیز پر محیط بھی ہے اور ہر چیز کے ارکان میں بھی موجود ہے۔ ہر چیز سے اتنی قربت کے باوجود وہ ان سے الگ بھی ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے:

مع کل شیء لا بمقارنہ و غیر کل شیء لا بمزایلہ (نہج البلاغہ خطبہ 1)

ترجمہ: وہ ہر چیز کے ساتھ ہے مگر جڑا ہوا نہیں ہے اور ہر چیز کا غیر بھی مگر ان سے الگ بھی نہیں ہے۔

کائنات اور اللہ کے تعلق کی اس حقیقت کو عام عالم، فقیہ اور فلسفی علمی اور عقلی طور پر جانتے ہیں اور عارف اس حقیقت کو اپنے باطن کی آنکھ سے دیکھتا ہے یا دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔

اسی طرح مناجات شعبانیہ کے اس جملے پر توجہ فرمائیں:

الھی ھب لی کمال الانقطاع الیک و انر ابصار قلوبنا بضیاء نظرھا الیک حتی تخرق ابصار القلوب حجب النور و تصیر ارواحنا معلقۃ بعز قدسک

ترجمہ: اے میرے معبود! مجھ پر کرم فرما کہ میں ہر چیز سے مکمل طور پر منقطع ہو کر مکمل طور تجھ سے وابستہ ہوجاؤں، اور ہمارے دلوں کی آنکھوں کو تیری طرف دیکھنے کو نور سے روشن کردے، یہاں تک کہ دلوں کی نگاہیں حجابات نور کے پار ہوجائیں اور ہماری روحیں تیری بارگاہ مقدس کی عزت کے ساتھ معلق ہوجائیں۔

دعا میں انسان اللہ تعالیٰ سے اپنی آرزؤں کی تکمیل کی درخواست کرتا ہے۔ اس دعا میں امیرالمومنین علیہ السلام ہمیں یہ سکھارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے یہ چیزیں مانگی جائیں:

☆ ہر چیز سے مکمل طور پر منقطع ہو کر مکمل طور پر اللہ سے وابستہ ہوجانا۔

☆ دل کی آنکھیں اس قابل ہوجائیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف نظر کریں۔

☆ دل کی آنکھیں اللہ تعالیٰ کی طرف نظر کرنے سے روشن ہوجائیں۔ یعنی جن دلوں کی آنکھیں اللہ تعالیٰ کی طرف نظر کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں وہ اندھی اور تاریک ہیں۔ جیسا کہ امام حسین علیہ السلام کی دعائے عرفہ کے ایک جملے میں ہے کہ **عمیت عین لاتراک** (اندھی ہے وہ آنکھ جو تجھے نہیں دیکھتی۔)

☆ دل کی نگاہیں نور کے حجابات سے پار ہوجائیں۔

☆ ہماری روحیں اللہ کی مقدس بارگاہ کی عزت کے ساتھ معلق ہوجائیں۔

یہ سب باتیں نظریاتی اور عملی عرفان کے دائرے میں آتی ہیں۔ مولوی، فقیہ اور فلسفی بیچارے کی بلا جانے کہ یہ سب کس دنیا کی باتیں ہیں۔

سب صوفیا دشمن اہل بیت ہیں!

اقامۃ البرہان کے صفحہ 48-47 پر روایات درج کی گئی ہیں کہ معصومین علیہم السلام نے فرمایا کہ ''سب صوفیاء ہمارے دشمن ہیں''۔ لیکن زمینی حقائق اس بات کی صریحاً نفی کرتے ہیں۔ مومنین کرام خود غور فرمائیں اور انصاف سے فیصلہ کریں کہ غیر شیعہ مسلمانوں میں سے جو مسلمان صوفیاء کے مسلک سے تعلق رکھتے ہیں اور صوفیاء کے ارادتمند ہیں وہ اہل بیت سے زیادہ محبت وعقیدت رکھتے ہیں یا تصوف اور صوفیاء کے مخالفین؟

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے عرفان اور تصوف کو ایک قرار دے کر شیعہ عرفاء کو بھی صوفی قرار دے دیا ہے۔ معاصر شیعہ عرفاء میں آیت اللہ خمینی، آیت اللہ تقی بہجت، آیت اللہ علامہ سید محمد حسین طباطبائی، آیت اللہ علامہ سید محمد حسین حسینی تہرانی، حجۃ الاسلام حسین انصاریاں،، آیت اللہ حسین مظاہری، آیت اللہ عبداللہ جوادی آملی، آیت اللہ مرتضیٰ مطہری، آیت اللہ علامہ حسن مصطفوی، آیت اللہ محمد تقی جعفری کا شمار عرفاء میں ہوتا ہے۔ تھوڑا سا پیچھے چلے جائیں تو شیعہ عرفاء میں آیت اللہ سید علی قاضی طباطبائی اور صدر الدین محمد بن ابراہیم شیرازی جیسی عظیم شخصیت بھی نظر آتی ہے۔ کیا مکتب تشیع کے یہ مایہ ناز افراد، یہ علم و عمل کے کوہ ہائے گراں اہل بیت رسول (علیہم السلام) کے دشمن ہیں؟ مالکم کیف تحکمون؟؟

علاوہ ازیں صوفیا کی کتب بھی اس بات کی نفی کرتی ہیں کہ صوفیاء دشمنان اہل بیت ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ وہ محبان اہل بیت تھے۔ سید علی ہجویری جو داتا گنج بخش کے نام سے معروف ہیں، صوفیاء میں بلند مقام حاصل رکھتے ہیں اور ان کی کتاب کشف المحجوب تصوف میں حجت اور بنیادی درسی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کے آٹھویں باب میں وہ اہل بیت (علیہم السلام) کا ذکر کرتے ہیں۔ اس باب کا عنوان ہی یہ ہے: ذکر ائمتہم من اہل البیت ''اہل بیت میں سے ان کے (یعنی صوفیا کے) آئمہ کا ذکر''۔

ہم ضیاء القرآن پبلی کیشنز کے شائع کردہ علامہ فضل الدین گوہر کے ترجمہ سے اقتباسات نقل کرتے ہیں۔ اس باب کا آغاز ان الفاظ سے ہو رہا ہے:

''رسول اللہ کے اہل بیت تقدس ازلی میں مخصوص تھے اور ہر ایک کو تصوف میں کمال حاصل تھا اور سب اہل تصوف کے سردار تھے بلاتخصیص۔ ان میں سے صرف چند کے متعلق تھوڑا سا بیان کروں گا ان شاء اللہ''۔

پھر وہ حضرت امام حسن علیہ السلام کے ذکر کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ان میں جگر بند مصطفی، ریحان دل مرتضیٰ، نور چشم زہراء رضی اللہ عنہا ابو محمد حسن بن علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ ان کو اس طریقت پر نظر غائر حاصل تھی اور اس موضوع پر ان کے دقیق نکات بکثرت ہیں۔''

حضرت امام حسین علیہ السلام کے ذکر کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اور اس جماعت میں شامل ہیں چراغ خاندان مصطفوی، جملہ تعلقات سے مجرد، اپنے زمانے کے سردار، ابوعبداللہ حسین ابن علی ابن ابیطالب رضی اللہ عنہم، محقق ولی اللہ، قبلہ اہل صفا، قتیل کربلا''۔

امام زین العابدین علیہ السلام کے ذکر کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اور اسی جماعت میں وارث نبوت، چراغ امت، سید مظلوم، امام مرحوم، عابدوں کے سرتاج اور اوتاد کے رہنما ابوالحسن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضوان اللہ عنہم ہیں۔ اپنے زمانے میں سب سے زیادہ مکرم اور عابد تھے، اظہار حقیقت اور دقیقہ گوئی میں مشہور تھے......''۔

امام زین العابدین علیہ السلام کے ذکر کا اختتام ان الفاظ پر کرتے ہیں:

''حضرت زین العابدین کے مناقب اتنے ہیں کہ احاطہ تحریر میں نہیں آسکتے''۔

پھر وہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے کا ذکر کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اہل بیت میں سے معاملت کی دلیلِ غالب، صاحبان مشاہدہ کی حجت ظاہرہ، اولادِ نبی میں امام اور نسلِ علی میں برگزیدہ ابوجعفر محمد بن علی بن حسین بن علی کرم اللہ وجہہ بن ابی طالب ہیں۔ آپ کو امام باقر رضی اللہ عنہ بھی کہتے ہیں۔ آپ کی کنیت ابوعبداللہ اور لقب باقر تھا۔ علمی باریکیاں اور کتابِ حق میں لطیف اشارات آپ سے مخصوص ہیں۔ آپ کی کرامات مشہور، نشانات روشن اور دلائل واضح ہیں.....''۔

پھر وہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے کا ذکر کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اسی جماعت میں شامل ہیں یوسفِ سنت، جمال طریقت، غواص معرفت اور زینت تصوف ابو محمد جعفر صادق بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم اجمعین۔ بلند حال اور نیک سیرت تھے۔ ان کا ظاہر آراستہ تھا اور باطن مرصع، جملہ علوم میں انہوں نے حسین اشارات چھوڑے ہیں۔ مشائخ کرام میں دقیق کلام اور وقوف معانی کے لیے مشہور ہیں......''۔

اس باب سے پہلے باب میں جو خلفائے راشدین کے بارے میں ہے، وہ حضرت علی علیہ السلام کے ذکر کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اور نیز ان میں برادر مصطفی، بحر بلا کے غواص، سوختہ آتش ولایت، تمام اولیاء اور اصفیاء کے

پیشوا ابوالحسن علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ہیں، جن کو تصوف میں شانِ عظیم اور مرتبہ بلند حاصل تھا۔

حضرت علی علیہ السلام کے ذکر کا اختتام وہ اس طرح کرتے ہیں:

''اہل تصوف حقائق عبارات، دقائق اشارات، تجرید دنیا و آخرت اور نظارہ تقدیر حق کے معاملہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی پیروی کرتے ہیں۔ان کے لطائف کلام لاتعداد ہیں اور ہمیں اس کتاب کو مختصر رکھنا ہے۔''

قارئین محترم! انصاف فرمائیں کہ یہ سید علی ہجویری دشمن اہل بیت ہیں؟ ان کی اس کتاب کو درسی کتاب کی حیثیت سے پڑھنے والے صوفیاء وارادتمندان تصوف دشمنان اہل بیت ہو سکتے ہیں؟

میر سید علی ہمدانی، جو ہندو پاک میں موجود ہمدانی سادات کے جد بزرگوار ہیں ایک صوفی بزرگ تھے۔علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے اقامۃ البرہان کے صفحہ 43 پر متحدہ ہندوستان کے مشہور صوفیاء میں ان کا اسم گرامی بھی درج کیا ہے۔فضائل اہل بیت پر ان کی کتاب ''مودۃ القربیٰ'' کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے جس میں انہوں نے چہاردہ معصومین کے فضائل تحریر کیے ہیں۔اسی طرح انہوں نے امیر المومنین علیہ السلام کے فضائل میں ''الاربعین فی فضائل امیر المومنین'' اور ''السبعین فی فضائل امیر المومنین'' جیسی کتب تحریر کیں۔(راقم الحروف نے ثانی الذکر کتاب کا عربی سے اردو ترجمہ حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے روزہ اطہر میں ضریح کے سامنے بیٹھ کر کیا۔الحمدللہ)

ان کی ایک اور کتاب ہے ''چہل اسرار'' جو ان کی چالیس رباعیات پر مشتمل ہے جو انہوں نے امیر المومنین علیہ السلام کی شان میں کہی ہیں۔ان میں سے دو رباعیاں ملاحظہ فرمائیے:

پرسید عزیزی کہ علی اہل کجائی گفتم بہ ولایت علی کز ہمدانم

نے زان ہمدانم کہ ندانند علی را من زان ہمہ دانم کہ علی راہمہ دانم

ترجمہ: میرے ایک عزیز نے پوچھا کہ علی کہاں کے رہنے والے ہو۔ میں نے کہا: ولایتِ علی (علیہ السلام) کی قسم! میں ہمدان سے ہوں۔لیکن میں ان ہمدان (یعنی علماء) میں سے نہیں ہوں جو علی (علیہ السلام) کی معرفت نہیں رکھتے، بلکہ میں اس لئے ہمدان (یعنی عالم) ہوں کہ علی (علیہ السلام) کو ہی

سب کچھ سمجھتا ہوں۔

گر مہر علی وآل بتولت نبود　　　امید شفاعت ز رسولت نبود

گر طاعت حق جملہ برآوردی تو　　　بی مہر علی ہیچ قبولت نبود

ترجمہ: اگر علی علیہ السلام اور آلِ بتول کی محبت تیرے دل میں نہ ہو تو تیرے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کی کوئی امید نہیں ہے۔ اگر تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت مکمل طور پر انجام دے دے تو علی (علیہ السلام) کی محبت کے بغیر کچھ بھی قبول نہ ہوگا۔

اسی طرح شیخ فرید الدین عطار نے اپنی کتاب تذکرۃ الاولیاء کا آغاز امام جعفر صادق علیہ السلام کے تذکرہ سے کیا اور کتاب کا اختتام حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے تذکرہ پر کیا؟

امام جعفر صادق علیہ السلام کا تذکرہ اس طرح شروع کرتے ہیں:

"آن سلطان ملت مصطفی، آن برہان حجت نبوی، آن عامل صدیق، آن عالم تحقیق، آن میوہ دل اولیاء، جگر گوشہ انبیاء، آن وارث نبی، آن عارف عاشق جعفر صادق رضی اللہ عنہ۔ ہم نے کہا تھا کہ اگر انبیاء، صحابہ اور اہل بیت کا ذکر کرنا ہو تو الگ سے کتاب لکھی جانی چاہیے۔ یہ کتاب اولیاء کے شرح احوال کے بارے میں ہے جن کا مرتبہ ان کے بعد آتا ہے۔ لیکن ہم تبرک کے طور پر اس کتاب کا آغاز حضرت صادق سے کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ اور جب ان کا ذکر کر دیا تو گویا سب کا ذکر کر دیا اس لیے کہ وہ سب ایک ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ جو لوگ ان کے مذہب کے ماننے والے ہیں وہ بارہ کے ماننے والے ہیں، یعنی ایک بارہ ہے اور بارہ ایک ہیں"۔

کیا اب بھی یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ سب صوفیاء دشمنِ اہل بیت ہیں؟

اگر ایک ہزار صحیح السند احادیث بھی آ جائیں کہ امام علیہ السلام نے فرمایا کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں تو ہم یہ کہہ کر ان احادیث کو رد کر دیں گے کہ امام معصوم حقائق کے خلاف بات نہیں کر سکتے۔ اسی طرح صوفیاء میں محبت اہل بیت کے ان قطعی شواہد کے پیش نظر ہم بلا خوف تردید کہتے ہیں کہ جن احادیث میں سب صوفیا کو دشمن اہل بیت کہا گیا ہے وہ جعلی ہیں، خواہ ان کی سند صحیح ہی کیوں نہ ہو۔

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ صوفیاء میں محبت علی (علیہ السلام) اور محبت اہل بیت کو بہت واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے لیکن جو لوگ ان کو دشمن اہل بیت کہتے ہیں ان کے پاس اس الزام کے ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ جس طرح ہم نے صوفیاء میں محبت وولایت اہل بیت کی واضح مثالیں پیش کی ہیں، کوئی شخص صوفیا میں اہل بیت سے دشمنی کے ایسے نمونے اور مثالیں پیش نہیں کر سکتا۔

ہاں یہ بات بالکل ممکن ہے کہ بعض دشمنان اہل بیت تصوف کی طرف رجحان رکھتے ہوں اس لیے کہ بنیادی طور پر تصوف ایک فطری چیز ہے جو تمام مذاہب میں موجود ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس بات کو بنیاد بنا کر سب صوفیاء وعرفاء کو دشمن اہل بیت قرار دے دیا جائے۔ مسلمانوں میں بھی بہت سے دشمن اہل بیت پائے جاتے تھے اور پائے جاتے ہیں۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام دشمنان اہل بیت کا دین ہے اور سب مسلمان دشمنان اہل بیت ہیں؟ مسلمانوں کے فقہاء اور محدثین میں بھی دشمنان اہل بیت دیکھے جا سکتے ہیں۔ کیا اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب فقہاء ومحدثین (جن میں علامہ نجفی صاحب دام ظلہ بھی شامل ہیں) دشمنان اہل بیت ہیں؟ اگر صوفیاء میں سے محبان اہل بیت کو دیکھ کر آپ ان سب کو محب اہل بیت کہنے کے روادار نہیں ہیں تو بعض دشمنان اہل بیت کے مائل بہ تصوف ہونے کی وجہ سے سب صوفیاء کو دشمن اہل بیت کہنا کہاں کا انصاف ہے؟ مالکم کیف تحکمون

صوفی وتصوف کی تعریف صوفیاء کی زبانی:

کسی بھی گروہ کے عقائد ونظریات کے بارے میں عادلانہ گفتگو وہی ہوگی جس میں ان کے موقف کو عدل وانصاف کے ساتھ سنا یا بیان کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ خود ان کے ہاں ان کے عقائد کی کیا تشریح ہے۔ کسی کے عقیدے کی ایسی تشریح کرنا جو خود ان کے ہاں قابل قبول نہیں ہے اور پھر اپنی اس خود ساختہ اور من مانی تشریح کی بنیاد پر ان کے خلاف حکم صادر کرنا ظلم کے زمرے میں آتا ہے۔

شیعہ اور تشیع کے مخالفین کی بعض تحریروں میں یہ لکھا گیا ہے کہ شیعہ اپنے اماموں کو معصوم مانتے ہیں اور چونکہ عصمت صرف انبیاء کی ہوتی ہے اس طرح شیعہ اپنے اماموں کو بھی نبی مانتے ہیں اور ختم نبوت کے منکر ہیں اور چونکہ ختم نبوت کے منکر ہیں لہٰذا کافر ہیں۔

معمولی سا عدل وانصاف رکھنے والا شخص بھی اس تشریح اور اس کی بنیاد پر شیعہ کے خلاف دیئے جانے والے اس فیصلے کے لچر پن کو سمجھ سکتا ہے۔اسی طرح تصوف اور صوفیاء کے بارے میں بھی عادلانہ گفتگو وہی ہوگی جس میں تصوف اور صوفیاء کے بارے میں ان کی اپنی معتبر اور مستند کتب کی روشنی میں ان کے عقائد کو بیان کیا جائے۔ان کے عقائد کی وہ تشریح کرنا جو خود ان کے ہاں قابل قبول نہیں ہے اور پھر اس خودساختہ اور من مانی تشریح کی بنیاد پر ان کے خلاف فیصلہ کرنا سراسر ظلم اور بے انصافی ہے۔

صوفی اور تصوف کی تعریف کے بارے میں ہم یہاں سید علی ہجویری (داتا گنج بخش) کی کتاب کشف المحجوب سے کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں جسے تصوف میں سند اور ٹیکسٹ بک کا درجہ حاصل ہے۔اس کتاب کے تیسرے باب کا عنوان ''تصوف'' ہے۔اس میں وہ لکھتے ہیں:

''لوگوں نے لفظ تصوف کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور کتابیں تصنیف کی ہیں۔ایک گروہ کا خیال ہے کہ صوفی کو اس لیے صوفی کہا جاتا ہے کہ وہ صوف یعنی پشم وغیرہ کا لباس پہنتا ہے۔دوسری جماعت کہتی ہے صوفی صف اول میں ہوتا ہے اس لیے صوفی کے نام سے موسوم ہے۔بعض کہتے ہیں کہ صوفیاء نے اصحاب صفہ کی محبت اختیار کی اس لیے صوفی کہلائے۔بعض دیگر لوگوں کا خیال ہے کہ لفظ صوفی صفا سے مشتق ہے۔۔۔۔۔یہ تشریحات لفظ صوفی کی لغوی صورت کو روشن کرنے سے قاصر ہیں۔گو ہر تشریح کے ساتھ دقیق استدلال موجود ہے''۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: چونکہ اہل تصوف اپنے اخلاق اور معاملات کو صاف رکھتے ہیں اور قلبی آفات سے بری ہوتے ہیں اس لیے صوفی کہلاتے ہیں۔اس فرقہ کے لیے یہ لفظ ''اسم علم'' کی حیثیت رکھتا ہے''۔(صفحہ 79)

آگے چل کر صفحہ 84 پر لکھتے ہیں: ''صوفی کا لفظ کامل اور محقق اولیائے کرام پر عائد ہوتا ہے۔مشائخ میں سے کسی نے کہا کہ:

من صفاہ الحب فھو صاف و من صفاہ الحبیب فھو صوفی

''جو محبت کے ساتھ مصفا ہو وہ صافی ہے اور جو دوست میں محو و مستغرق ہو وہ صوفی ہے''۔

اس جملے کا زیادہ سلیس ترجمہ اس طرح بھی کیا جا سکتا ہے کہ جسے اللہ کی محبت آلائشوں سے صاف

کر دے وہ صافی ہوتا ہے اور جسے محبوب یعنی اللہ تعالیٰ آلائشوں سے صاف کر دے وہ صوفی ہوتا ہے۔

اسی صفحہ پر آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں: ان میں جو اہل کمال ہوں وہ صوفی کہلاتے ہیں، ان کے متعلقین اور طالبوں کو متصوف کہتے ہیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

الصفا ولایۃ لھا آیۃ و روایۃ و التصوف حکایۃ للصفاء بلا شکایہ

''صفا ولایت ہے جس کے نشانات و روایات ہیں اور تصوف اس صفا کی حکایت بے شکایت ہے''

اہل صفا تین جماعتوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں:

1۔صوفی 2۔متصوف 3۔مستصوف۔صوفی کی انا فنا ہو جاتی ہے اور حق اس کی زندگی ہوتی ہے، وہ آلات بشریت سے آزاد ہوتا ہے اور صحیح معنوں میں حقیقت و حقائق سے واقف ہوتا ہے۔متصوف وہ ہے جو اس مقام کو مجاہدہ سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو اور اس کوشش میں صوفیاء کی مثال سامنے رکھ کر اپنے آپ کو درست کرنے میں مصروف ہو۔مستصوف وہ ہے جو روپے پیسے، طاقت اور دنیوی جاہ حاصل کرنے کے لیے صوفیاء کی نقالی کر رہا ہو اور پہلی دو صورتوں سے بے خبر ہو۔ چنانچہ کہا گیا ہے:

المستصوف عند الصوفیۃ کالذباب و عند غیر ھم کالذئاب

'مستصوف صوفیاء کے نزدیک مکھی کی طرح حقیر ہوتا ہے اور عام لوگوں کے لیے بھیڑیئے کی طرح'۔

صفحہ 86 پر وہ لکھتے ہیں: ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

التصوف ترک کل حظ النفس

''تصوف نفس کے ہر قسم کے حظ (یعنی ہر قسم کی نفسانی لذتوں) کو ترک کرنے کا نام ہے''۔

تھوڑا اور آگے چل کر ابوالحسن نوری کا ہی بیان نقل کرتے ہیں:

الصوفیۃ ھم الذین صفت ارواحھم فصار و فی الصف الاول بین یدی الحق

''صوفی وہ ہیں جن کی روحیں بشریت کی کثافت سے پاک اور آفت سے پاک اور آفت انسانی سے صاف ہوں، جو ہوا و ہوس سے آزاد ہوں اور صف اول میں اور درجہ اعلیٰ پر حق آرمیدہ اور از خلق رمیدہ ہوں''۔

اس جملے کا سلیس ترجمہ اس طرح سے کیا جا سکتا ہے کہ صوفیہ وہ ہیں جن کی روحیں صاف ہو چکی

ہوں اور وہ حق تعالیٰ کے حضور میں صف اول میں کھڑے ہوں۔

صفحہ 88 پر لکھتے ہیں: حصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

التصوف صفاء السر من کدورۃ المخالفه

''تصوف دل اور باطن کو حق کی مخالفت کی کدورت سے صاف کرنے کا نام ہے''۔

مزید آگے چل کر لکھتے ہیں:

محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم (یعنی امام محمد باقر علیہ السلام) نے فرمایا:

التصوف خلق فمن زاد علیک فی الخلق زاد علیک فی التصوف

''تصوف نیک خوئی اور خوش اخلاقی ہے، جو زیادہ نیک خو ہو وہ زیادہ صوفی ہوتا ہے''۔

اس جملے کا زیادہ بہتر اور سلیس ترجمہ یہ ہے کہ: تصوف اخلاق ہے اور جو اخلاق میں تم سے زیادہ ہے وہ تصوف میں تم سے زیادہ ہے۔

تصوف اور صوفی کی یہ تعریفات جو تصوف کی اس مستند کتاب میں بیان ہوئی ہیں اور تصوف کی جو تصویر علامہ محمد حسین نجفی صاحب دام ظلہ نے اقامۃ البرہان میں پیش کی ہے اس میں کتنا فاصلہ ہے؟ اس کا فیصلہ ہم قارئین کے عدل پر چھوڑتے ہیں۔

اتباع شریعت صوفیا کی نظر میں:

تصوف اور صوفیاء کے دیگر بے انصاف مخالفین کی طرح علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے بھی اپنی کتاب اقامۃ البرہان میں جگہ جگہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے صوفیاء کتاب وسنت اور شریعت کے پابند نہیں ہوتے، ان سے تمام ظاہری عبادات ساقط ہوتی ہیں۔ ہم یہاں بعض صوفیاء کے اقوال نقل کرتے ہیں جن کو دیکھنے کے بعد ہر باانصاف قاری خود سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کر سکے گا۔ ہم نے یہ اقتباسات تصوف کے امام ابوالقاسم قشیری کے رسالہ قشیریہ، اردو ترجمہ شاہ محمد چشتی، مطبوعہ ادارہ پیغام القرآن لاہور سے نقل کیے ہیں۔ قارئین محترم سے التماس ہے کہ ان اقتباسات کو ٹھہر ٹھہر کر، سکون سے اور سمجھ کر پڑھیں۔ ایک بار نہیں بلکہ چند بار بلکہ بار بار پڑھیں۔ اس سے نہ صرف تصوف وعرفان کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی بلکہ خود

ان کے باطن میں بھی نورانی تبدیلی آئے گی۔ نیز کتاب کے آئندہ مباحث کو سمجھنے میں بھی اس سے مدد ملے گی۔اس کتاب میں صفحہ 56 سے ایک باب کا آغاز ہوتا ہے جس کا عنوان ہے:

تذکرہ مشائخ، سیرت اور اقوال، عظمت شریعت

مندرجہ ذیل اقتباسات اسی باب سے لیے گئے ہیں۔

سری سقطی کی نظر میں تصوف کے تین معانی:

☆ صوفی کا نورِ معرفت ایسا ہو کہ اس سے اس کی پرہیزگاری (یعنی تقویٰ) متاثر نہ ہو۔

☆ دل سے وہ بات نہ نکالے جو نصوص کتاب وسنت کے مخالف ہو۔

☆ کرامات دکھانے کے شوق میں اللہ کے حرام کردہ کاموں میں نہ پڑے۔ صفحہ 62

ابوالحسین احمد بن ابوالحواری

☆ جو شخص دنیا کو محبت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس سے پیار رکھتا ہے تو اللہ اس کے دل سے یقین کا نور اور زہد نکال دیتا ہے۔

☆ جس شخص نے اتباع رسول کے بغیر کوئی کام کیا اسے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

☆ حقیقی رونا وہ ہوتا ہے کہ انسان ان اوقات پر روئے جن میں شریعت کی مطابقت نہیں کر سکا۔صفحہ 76

ابوحفص عمر بن مسلمہ الحداد

☆ جو شخص ہر موقع پر قرآن وسنت کی روشنی میں اپنے افعال کو احوال کے مقابلے میں نہیں پرکھتا اور اپنے دلی خیالات کو برا نہیں سمجھتا ہم اسے صوفیہ کی گنتی میں نہیں رکھتے۔ (ایضاً)

ابوسری منصور بن عمار

☆ عام بندے کا بہتر لباس تواضع، عاجزی اور انکساری ہوتا ہے لیکن عارف کا بہترین لباس تقویٰ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلِبَاسُ التَّقْوىٰ ذَالِکَ خَیر (اعراف:26)

☆ جو شخص دنیوی مصیبت پر چلانے لگتا ہے اس کی مصیبت دین کی طرف موڑ دی جاتی ہے۔

ابوالقاسم جنید بن محمد بغدادی جو کہ جنید بغدادی کے نام سے مشہور ہیں:

☆ اللہ تعالیٰ تک رسائی کے سارے ہی راستے بند ہیں لیکن ان کے لیے کھلے ہیں جو رسول اللہ کی پیروی کرتے ہیں۔

☆ جو شخص قرآن حفظ نہیں کرتا اور حدیث نہیں لکھتا ہمارے گروہ صلحاء میں اس کی پیروی نہیں ہوگی کیونکہ ہمارا علم کتاب وسنت کا علم ہے۔

☆ ہمارا مذہب کتاب وسنت کے اصولوں کا پابند ہے۔

ابوعثمان سعید بن اسماعیل جبری:

اللہ کی صحبت میں: حسن ادب، اللہ کی دائمی ہیبت اور مراقبہ کا خیال رکھو۔

رسول اللہ کی صحبت میں: اتباع سنت اور ظاہری علم کی پاسداری کا خیال رہے۔

اولیاء اللہ کی صحبت میں: احترام اور خدمت کا خیال رہنا چاہیے۔

گھر والوں کی صحبت میں: حسن خلق کا مظاہرہ کرو۔

برادری کی صحبت میں: خندہ رو رہو لیکن گناہ تک نہ پہنچو۔

جاہلوں کی صحبت میں: ان کے لیے دعا کرو اور ان کے ساتھ رحمت سے پیش آؤ۔

☆ جو شخص اپنے قول وفعل میں سنت کو حاکم بنا لیتا ہے ہمیشہ دانائی کی بات کرتا ہے اور جو خواہشات نفسانی کو سوار کر لیتا ہے وہ بدعت کے کام کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنْ تُطِیْعُوْہُ تَهْتَدُوْا (اگر تم ان کی (یعنی رسول اللہ) کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے۔) (نور:54)

ابوالحسین احمد بن محمد نوری:

☆ نفس کو اچھی لگنے والی ہر چیز کو ترک کرنے کا نام تصوف ہے۔

احمد بن محمد بن سہل بن عطا:

☆ جو اپنے آپ کو آداب شریعت کا پابند بنا لیتا ہے اللہ اس کے دل میں نور معرفت روشن کر دیتا ہے، ایسا کوئی

مقام نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمانبرداری سے بڑھ جائے خواہ وہ امور احکام ہوں، افعال ہوں یا اخلاق۔(94)

ابراہیم بن احمد الخواص:

☆ دل کا علاج: دل کے علاج کے لیے پانچ چیزیں معتبر ہیں:

سمجھ کر قرآن پڑھنا، بھوکا رہنا، شب بیداری، سحری کا رونا اور صالحین کی صحبت میں رہنا۔

بنان بن محمد حمال:

صوفیہ کی شان: صوفیہ کی سب سے بڑی شان یہ ہے کہ اللہ کے ضمانت کیے گئے رزق پر بھروسا کرنا، اللہ کے احکام پر پورا اترنا، رازداری کرنا اور کونین سے بے نیاز ہوجانا۔

ابوحمزہ بغدادی بزاز:

جو اللہ تک جانے کے راستے کو پہچان لے اس کے لیے اس پر چلنا آسان ہوجاتا ہے مگر وہ راستہ احوال و اقوال وافعال رسول کی اتباع کے بغیر نہیں مل سکتا۔

ابومحمد عبداللہ بن محمد مرتعش:

ارادت: ارادت یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنی تمام مرادوں سے اپنے نفس کو روک لے، اللہ کے احکام پر عمل کرے اور اللہ کے فیصلوں پر راضی رہے۔ کسی نے ان سے کہا کہ فلاں شخص پانی پر چلتا ہے تو آپ نے جواب دیا: میرے نزدیک اللہ تعالیٰ جسے نفسانی خواہشات کی مخالفت کی ہمت دیتا ہے وہ ہوا میں اڑ کر دکھانے والے سے بہتر ہوتا ہے۔(100)

ابوعمر اسماعیل بن نجید:

تصوف: اللہ کے احکام پر عمل اور اس کے منع کیے ہوئے کاموں پر صبر سے کام لینے کا نام تصوف ہے۔

ابوعبداللہ محمد بن خفیف شیرازی:

قرب: خدا سے تمہارے قرب کا مقصد یہ ہے کہ تو شریعت کے مطابق کام انجام دینے کے لیے تیار رہے اور

اللہ کے تم سے قرب کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہیں اس کی توفیق دے۔(110)

ابوالقاسم ابراہیم بن محمد نصرآبادی:

☆ تصوف کی اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان قرآن وسنت پر عمل کرے،خواہشات اور بدعتوں کوترک کرے، مشائخ کی قابل احترام چیزوں کی تعظیم کرے،مخلوق کی معذوریاں سمجھے،اپنے کاری وظائف کو ہمیشہ قائم رکھے،رخصت والے کام چھوڑ دے اورتاویلات کے پیچھے نہ پڑے۔

حسین بن علی بن یزدانیار:

جب تک تم اللہ سے انس اورصحبت رکھتے ہوتو لوگوں سے انس نہیں ہونا چاہیے، جب تک تم فضول باتوں میں لگے ہوئے ہوتب تک اللہ سے محبت نہ ہوگی ،تم لوگوں کے ہاں باوقار بننا چاہتے ہوتوتمہارااللہ کے ہاں وقار نہ ہوگا۔(106)

ابوسعیداعرابی:

وہ شخص سب سے زیادہ نقصان میں ہے جولوگوں میں اپنے نیک اعمال دکھائے اورشہ رگ سے زیادہ قریب اللہ کے ہاں برے اعمال جادکھائے۔(ایضاً)

ابوبکرمحمد بن داؤد دینوری:

انسانی معدہ مختلف کھانے جمع ہونے کی جگہ ہے۔جب تم اس میں حلال چیز ڈالوگےتو تمہارے اعضاء نیک کام کرنے لگیں گے۔اور جب اس میں شبہ والی چیزیں ڈالوگےتو اللہ کی راہ میں شبہے پیدا ہوجائیں گے اوراگراس میں قابل گرفت چیز ڈالوگےتوتمہارے اوراللہ کے درمیان پردے حائل ہوجائیں گے۔(108)

عبداللہ بن محمد رازی:

دل کیوں اندھاہوتا ہے؟

حضرت عبداللہ رازی سے پوچھا گیا کہ لوگ اپنے عیبوں سے واقف ہونے کے باوجوددرست راہ کیوں نہیں اپناتے؟ فرمایا:اس لیے کہ لوگ علم پرعمل کرنے کی بجائے اس پرفخر کرنا شروع کردیتے ہیں،ظاہری کاموں

میں لگ جاتے ہیں اور باطن پر توجہ نہیں دیتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو اندھا کر دیتا ہے اور ان کے اعضاء کو عبادت سے روک دیتا ہے۔(ایضاً)

صوفیاء میں سے جو شعراء گزرے ہیں انہوں نے اپنے اشعار میں اتباع شریعت کی سختی سے تاکید کی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

بروں از شرع هر راهی که خواهی رفت گمراهی

خلاف دین هر آن علمی که خواهی خواند شیطانی (دیوان عراقی)

ترجمہ: شریعت سے باہر نکل کر جس راستے پر بھی جاؤ گے گمراہ رہو گے

اور دین کے خلاف جو علم بھی پڑھو گے وہ شیطانی علم ہوگا۔

به طاعت کوش تا دیندار گردی که بی دین رانزیبد لاف مردی (دیوان عطار)

ترجمہ: اللہ کی اطاعت کرنے کی کوشش میں مصروف رہو تا کہ دین دار ہو جاؤ،

اس لیے کہ بے دین شخص کو مرد ہونے کی ڈینگیں مارنا زیب نہیں دیتا۔

گرچہ راہ بر آتش سوزان کند خویشتن را قالب قرآن کند

ترجمہ: عارف اگر چہ جلتی ہوئی آگ پر چلتا ہے لیکن خود کو مجسم قرآن بنا دیتا ہے۔

مطلب یہ کہ عارف کا راستہ آسان راستہ نہیں، وہ قرآن کے راستے پر اتنی باریک بینی سے چلتا ہے جو آگ پر جلنے کی مانند تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن اس کی برکت سے وہ مجسم قرآن ہو جاتا ہے۔

اسی بات کو علامہ اقبال نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

پرستش کن خدای جاویدان را مطیع امر کن تن را و جان را

(فتوت نامہ عطار)

ترجمہ: ہمیشہ باقی رہنے والے خدا کی عبادت کرو اور

اپنے جسم وجاں کو اس کے امر کا مطیع وفرمانبردار کردو۔

اپنی ایک اور کتاب میں جس کا نام سی فصل ہے، عطار کہتے ہیں:

سراسراز شراب عشق سرمست　　　　همه در عشق او جان داده از دست

ترجمہ: عرفاء وصوفیاء عشق کی شراب میں سرمست ہوتے ہیں،

سب اس کے عشق میں اپنی جان سے ہاتھ دھوئے ہوتے ہیں۔

همه را در دل وجان حب حیدر　　　　روند در آتش سوزان چو بوذر

ترجمہ: سب کے دل اور جان میں حیدر کی محبت ہوتی ہے،

وہ سب ابوذر کی طرح اس جلتی ہوئی آگ میں داخل ہوجاتے ہیں۔

همه در عشق او باشند سلمان　　　　همه را در دل وجان نور ایشان

ترجمہ: سب اس کے عشق میں سلمان فارسی کی طرح ہوجاتے ہیں،

سب کے دل وجان میں انہیں کا نور رہوتا ہے۔

تو گر خواہی کہ دانی عاشقان را　　　　طریق رفتن آن سالکان را

ترجمہ: اگر تم ان عاشقان الٰہی کو جاننا چاہتے ہو، ان سالکان راہ

معرفت کے طریقے اور راستے کو جاننا چاہتے ہوتو

بہ راہ حیدر صفدر روان شو　　　　تو ہم در راہ آن چون عاشقان شو

ترجمہ: حیدر صفدر کے راستے پر روانہ ہوجائے، تم بھی اس

کے راستے میں ان عاشقان الٰہی کی طرح ہوجاؤ۔

ہم اس عنوان پر گفتگو کا اختتام اس اقتباس پر کرتے ہیں:

شاہ محمد مسیح اللہ اپنی کتاب شریعت وتصوف میں ''حقیقت تصوف'' کے عنوان سے تصوف کا تعارف اور تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”شریعت کا وہ جز جو اعمال باطنی سے متعلق ہے تصوف وسلوک اور وہ جز جو اعمال ظاہری سے متعلق ہے، فقہ کہلاتا ہے۔اس کا موضوع تہذیب اخلاق اور غرض رضائے الٰہی ہے اور اس کے حصول کا ذریعہ شریعت کے حکموں پر پورے طور سے چلنا ہے۔

گویا کہ تصوف دین کی روح و معنی یا کیف وکمال کا نام ہے،جس کا کام باطن کو اخلاق ذمیمہ، شہوت،آفات لسانی،حقد،حسد،حب دنیا،حب جاہ،بخل،حرص،عجب،ریا اور غرور سے پاک کرنا اور فضائل یعنی اخلاق حمیدہ سے توبہ،صبر،شکر،خوف ورجا،زہد،توحید،محبت،توکل،شوق،اخلاص،صدق،مراقبہ ومحاسبہ اور تفکر سے آراستہ کرنا ہے تاکہ توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے جو مقصود حیات ہے۔اس لیے تصوف وطریقت دین وشریعت کے قطعا منافی نہیں ہے۔ بلکہ ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ صوفی بنے کہ اس کے بغیر فی الواقع ہر مسلمان پورا مسلمان کہلانے کا مستحق ہی نہیں رہتا۔“ (صفحہ 16)

اس اقتباس میں یہ جملہ قابل غور ہے:”اس کا (یعنی تصوف کا) موضوع تہذیب اخلاق اور غرض رضائے الٰہی ہے اور اس کے حصول کا ذریعہ شریعت کے حکموں پر پورے طور سے چلنا ہے“۔اس میں واضح اور واشگاف الفاظ میں کہہ دیا گیا ہے کہ تہذیب اخلاق اور رضائے الٰہی کا حصول تصوف کا مقصد ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ شریعت کے حکموں پر پورے طور سے چلنا ہے۔اس کے بعد بھی اگر کوئی یہ کہے کہ تصوف وعرفان میں سالک وعارف سے تمام ظاہری عبادات ساقط ہیں،تو یہ محض جھوٹ اور بہتان ہوگا۔

علامہ نجفی صاحب کے تضادات:

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کی کتاب اقامۃ البرہان پر آپ کو جگہ جگہ تضادات نظر آئیں گے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(1)**تصوف کی اساس:**

علامہ محمد حسین نجفی صاحب دام ظلہ اقامۃ البرہان کے صفحہ 38 پر تحریر فرماتے ہیں:

اگرچہ تصوف کی کوئی جامع ومانع تعریف آج تک نہیں ہوسکی مگر دو ایسے بنیادی عنصر ہیں جو تصوف کی اصل سمجھے جاتے ہیں۔(1) انسان کا خدا کے ساتھ براہ راست مکالمہ (2) نفس انسانی کا حقیقت

مطلقہ (خدا) کے ساتھ مل جانا جسے یہ لوگ وصال یا فنا کہتے ہیں۔

پھر صفحہ 53 پر صوفیا کے عقائد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان لوگوں کے مسلک کی اساس ہی حلول، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود یا وحدۃ الموجود پر ہے''۔ قارئین محترم یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اصل اور اساس دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی بنیاد۔

صفحہ 38 اور صفحہ 53 کے بیانات میں کس قدر واضح تضاد موجود ہے۔ سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ علامہ نجفی صاحب دام ظلہ یہ بات واضح کریں کی تصوف کی بنیاد اور اساس کیا ہے؟ صفحہ 38 کے مطابق (1) انسان کا خدا کے ساتھ براہ راست مکالمہ (2) نفس انسانی کا حقیقت مطلقہ (خدا) کے ساتھ مل جانا جسے یہ لوگ وصال یا فنا کہتے ہیں۔ یا صفحہ 53 کے مطابق ان لوگوں کے مسلک کی اساس ہی حلول، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود یا وحدۃ الموجود پر ہے۔

دوسری بات یہ کہ کیا علامہ نجفی صاحب دام ظلہ تصوف کی کسی معتبر کتاب میں یہ دکھا سکتے ہیں کہ تصوف کی بنیاد اور اساس صفحہ 38 والی دو باتیں ہیں یا صفحہ 53 والی تین چیزیں؟

(یہاں ہم قارئین گرامی سے درخواست کریں گے کہ ایک بار پھر تصوف کے بارے میں صوفیاء کے اقوال کو دیکھ لیں جنہیں ہم نے رسالہ قشیریہ سے نقل کیا ہے۔ ان میں سے بعض اقوال میں تصوف کی تعریف بھی بیان ہوئی ہے جس کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے جنہیں علامہ نجفی صاحب دام ظلہ تصوف وعرفان کی اساس کہہ رہے ہیں)

علامہ صاحب دام ظلہ کے اس بیان کو دیکھ کر کہ ''ان لوگوں کے مسلک کی اساس ہی حلول، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود یا وحدۃ الموجود پر ہے'' یوٹیوب پر ایک متعصب اور جاہل ناصبی مولوی کی ایک تقریر یاد آ گئی جس میں وہ شیعہ مذہب کے خلاف زہر اگلتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ''شیعہ مذہب کا بانی عبداللہ ابن سبا یہودی ہے اور شیعہ مذہب کی بنیاد متعہ اور تقیہ پر ہے اور متعہ زنا ہے اور تقیہ جھوٹ۔'' علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کا یہ بیان کہ تصوف کے بانی بنو امیہ ہیں اور اس کی اساس حلول، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود یا وحدۃ الموجود ہے اس جاہل متعصب مولوی کے بیان سے ذرا بھی مختلف نہیں ہے۔

دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں ان کے بنیادی عقائد ان کی کتب میں موجود ہوتے ہیں۔ تحقیق اور

انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی کے عقائد ونظریات پر تنقید کرتے وقت پہلے ان کے عقائد ونظریات کو انہی کی معتبر کتب سے نقل کیا جائے بعد میں ان پر تنقید وتبصرہ کیا جائے۔ بنا بریں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ علامہ نجفی صاحب دام ظلہ اپنے اس دعویٰ کی کوئی دلیل پیش کرتے ،تصوف کی کسی معتبر کتاب کا حوالہ دیتے کہ تصوف کی اساس حلول، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود یا وحدۃ الموجود پر ہے۔ علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کے اس بیان کو پڑھ کر ایک بار پھر دل میں یہ دردناک احساس پیدا ہوتا ہے کہ کاش انہوں نے یہ کتاب لکھنے سے قبل تصوف کی ایک آدھ معیاری اور مستند کتاب کا مطالعہ کرلیا ہوتا۔

(2) اسی موضوع پر علامہ نجفی دام ظلہ کا ایک اور بھیانک تضاد ملاحظہ فرمائیں:

پہلے تو وہ بیان فرماتے ہیں کہ تصوف دوسری صدی ہجری میں منظر عام پر آیا۔ پھر دوسری صدی سے لے کر بعد میں آنے والی تمام صدیوں کے معروف صوفیاء کے ناموں کی فہرست دینے کے بعد صفحہ 53 پر لکھتے ہیں: تصوف کی اساس ہی حلول، وحدت الوجود اور وحدت الشہود یا یا وحدت الموجود پر رکھی گئی ہے۔ مزید آگے چل کر صفحہ 60 پر تحریر فرماتے ہیں: وحدت الوجود کا نظریہ ابن عربی (وفات 638ہجری) نے ایجاد کیا تھا اور وحدت الشہود کا عقیدہ شیخ علاء الدین (وفات 736ہجری) نے وضع کیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تصوف کا آغاز دوسری صدی ہجری میں ہو گیا تھا تو اس کی اساس اس وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر کس طرح رکھی گئی جن کے موجد ساتویں اور آٹھویں ہجری میں پیدا ہو رہے ہیں۔ خود تصوف دوسری ہجری میں وجود میں آیا اور اس کی اساس ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں؟

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

(3) علامہ نجفی کی تضاد گوئی کی ایک اور مثال:

صفحہ 77 پر لکھتے ہیں: ''شاعر تو قرآنی فرمان کے مطابق ''فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ'' ہر میدان میں چکر لگاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دانشمندوں کا قول ہے کہ کسی شاعر کے مذہب ومسلک کا اس کے اشعار پڑھ کر پتا نہیں چلتا''۔

لیکن خود اپنی اسی کتاب میں جا بجا صوفی شعراء کے عقائد کو بیان کرنے کے لیے ان کے اشعار نقل کرتے رہے ہیں اوران اشعار میں بیان شدہ عقائد کی بنیاد پر ان کا مؤاخذہ ومحاکمہ کرتے رہے ہیں۔بعض مقامات پر تو نامعلوم
شعراء کے اشعار بھی نقل کر کے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ صفحہ 68 پر لکھتے ہیں: چنانچہ ایک صوفی شاعر کہتا ہے:

خدارا یافتم حقیقت بیرون رفتم از قید شریعت

(4)صفحہ 76 پر لکھتے ہیں: رب شہرۃ لا اصل لہ یعنی بہت سی مشہور باتیں بے بنیاد ہوتی ہیں۔لیکن صفحہ 56 پر لکھتے ہیں: ''مشہور ہے کہ حلاج کے کفر اور اس کے قتل کے جواز کا فتویٰ دینے اور اس کے قتل کے محضر نامے پر دستخط کرنے والوں میں حضرت امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کے نائب خاص جناب حسین بن روح نوبختی بھی شامل تھے''۔(صفحہ 85 پر آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ یہ حضرت امام زمانہ پر ایک بہت بڑی تہمت ہے)

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کی تضاد گوئی کی یہ چند مثالیں تھیں۔مزید مثالیں آپ اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

☆☆☆

اسلام اور رھبانیت

اقامۃ البرہان کے صفحہ 40 پر عنوان قائم کرتے ہیں:

تصوف رہبانیت کی ہی بدلی ہوئی شکل کا نام ہے؟

اس عنوان کے تحت علامہ نجفی دام ظلہ لکھتے ہیں:

''قرآن مجید علی الاعلان کہتا ہے کہ رہبانیت (دنیوی زیبائش وآرائش اور دنیوی لذائذ کا ترک کرنا) عیسائیوں نے ازخود گھڑ لیا تھا۔

وَرُهْبَانِيَّةً اِبْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاءَ

رِضْوَانِ اللہِ فَمَا رَعَوْھَا حَقَّ رِعَایَتِھَا (حدید:27)

ترجمہ: رہبانیت کو ہم نے ان پر واجب قرار نہیں دیا تھا بلکہ انہوں نے اسے خود ایجاد کیا تھا لیکن پھر بھی اسے نباہ نہ سکے۔

اس سلسلے کی پہلی بات تو یہ ہے کہ علامہ نجفی صاحب نے بریکٹ میں رہبانیت کے جو معنی لکھے ہیں وہ درست نہیں ہیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ آیت کا ترجمہ ناقص لکھا ہے۔ آیت کے اس حصے کے ترجمہ کو کھا ہی گئے: اِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللہِ۔ اس جملے کا ترجمہ یہ ہے کہ اس رہبانیت کو ایجاد کرنے کا ان کا اور کوئی مقصد نہیں تھا سوائے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے۔

انتہائی دکھ اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے اس عنوان پر علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے جو گفتگو کی ہے وہ بھی انتہائی عامیانہ اور سراسر غیر عالمانہ ہے جو ان کے علمی قد کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ اس کتاب کو دیکھ کر بار بار علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کے ایک شاگرد خاص کی ایک کتاب کا خیال آتا رہا جو اس نے آج سے تقریبا پچیس سال پہلے رد شیخیت کے موضوع پر لکھی اور علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے اس پر تقریظ بھی سپرد قلم فرمائی۔ کبھی کبھی یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ شاید تصوف کی رد میں یہ کتاب آیت اللہ محمد حسین نجفی صاحب دام ظلہ نے لکھی ہی نہ ہو بلکہ ان کے کسی شاگرد نے لکھ کر ان کے نام سے شائع کر دی ہو۔ اگر چہ ایسا ممکن نہیں ہے لیکن جب علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کے بارے میں حسن ظن سے کام لینے کا ارادہ کرتا ہوں تو ایسے ہی خیالات ذہن میں آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان خیالات کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کی علمی شخصیت کو بٹہ لگنے سے بچایا جائے۔

اب مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں رہبانیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس آیت سے عام طور پر رہبانیت کی نفی کا جو تاثر لیا جاتا ہے وہ کسی صورت میں درست نہیں ہے۔

اس آیت کی روشنی میں صحیح غور وفکر کیا جائے تو صورت حال یکسر مختلف نظر آتی ہے۔ اس آیت میں غور وفکر کرنے سے چند باتیں سامنے آتی ہیں جنہیں ترتیب وار اس طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے:

(1) رہبانیت اللہ تعالٰی نے فرض نہیں کی تھی۔

(2) مسیحی راہبوں نے اسے خود سے ایجاد کر لیا تھا۔

(3) رہبانیت کو ایجاد کرنے کا واحد مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔

(4) لیکن وہ اس رہبانیت کو نباہ نہ سکے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رہبانیت ایجاد کرنے کی مذمت نہیں کی، صرف یہ فرمایا کہ ہم نے ان پر اسے فرض نہیں کیا تھا، انہوں نے خود اسے ایجاد کرلیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ رہبانیت کو ایجاد کرنے کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس رہبانیت سے اللہ کی رضا حاصل نہیں ہوتی۔ اس سے یہ واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مقصد کو بھی پسندیدہ قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی گرفت صرف اس بات پر کی کہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے جو رہبانیت انہوں نے ایجاد کی تھی اسے نباہ نہ سکے اور اس کا حق ادا نہ کرسکے۔ یعنی اگر وہ اسے نباہ لیتے، اس کا حق ادا کر سکتے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس طرح مجموعی طور پر اس آیت سے رہبانیت کے ناپسندیدہ ہونے کا تاثر لینا ایک سنگین غلطی ہے۔

علامہ سید محمد حسین طباطبائی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ تفسیر المیزان میں اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں:

و فیه اشارة الی انها کانت مرضیة عنده تعالیٰ و ان لم یشرعها بل کانوا هم المبتدعین لها

ترجمہ: اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ (رہبانیت) اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ تھی اگرچہ اس نے اسے مقرر نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے خود اسے ایجاد کرلیا تھا۔ (المیزان 173:19)

رہبانیت کے صحیح معنی:

رہبانیت کے صحیح معنی کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید کی دو آیات پر نظر ڈالتے ہیں۔ سورۂ بقرہ آیت 40 وایای فارھبون اور سورۂ نحل آیت 51 فایای فارھبون دونوں کا ترجمہ ایک ہی ہے کہ: ''صرف مجھ سے ہی ڈرتے رہو''۔ یہاں اللہ کے خوف کے لیے جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ ہے فارھبون۔ عربی گرائمر کے لحاظ سے اسے فعلِ امر کہتے ہیں۔ اور جو اس امر کی اطاعت کرے گا عربی زبان کے قواعد کے لحاظ سے وہ اس فعل کا فاعل ہوگا جس کے لیے اسم فاعل راہب ہوگا۔ قرآن مجید کی ان دو آیات پر عمل کرنے والا شخص عربی لغت کی رو سے لامحالہ راہب ہوگا۔ یہ دو آیات صریح اور واضح طور پر اہل ایمان کو راہب بننے کا حکم

دے رہی ہیں۔ چونکہ قرآن کے اس حکم کی اطاعت واجب ہے اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کے حکم کے مطابق راہب ہونا واجب ہے۔ اگر راہب ہونا واجب ہے تو رہبانیت ناپسندیدہ کیسے ہوسکتی ہے؟

ہاں یہ ضرور ہے کہ اسلام میں رہبانیت کی شکل مسیحی رہبانیت سے ضرور مختلف ہوگی (خاص طور پر اس رہبانیت سے جو اللہ نے فرض نہیں کی تھی)۔ جس طرح نماز شریعت عیسوی میں بھی واجب تھی اور شریعت محمدی میں بھی واجب ہے لیکن دونوں کی شکل ایک نہیں ہے۔ روزہ دونوں شریعتوں میں واجب ہے لیکن روزے کی شکل دونوں میں الگ ہے۔ اسی طرح دونوں کی رہبانیت کی شکل بھی مختلف ہوگی۔ مسیحی معاشرے کے لیے حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی سیرت وہی حیثیت رکھتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کی حیثیت مسلم معاشرے کے لیے ہے۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم دونوں نے شادی نہیں کی تھی۔ لہٰذا اگر مسیحیت کے مذہبی حلقوں میں مجرد رہنے کو تقدس کی علامت سمجھا جاتا ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔ ان کے ہاں اس کا مضبوط جواز موجود ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ رہبانیت کے معنی ترک دنیا ہے۔ یہ ہرگز درست نہیں ہے۔ رہبانیت کے معنی ترک دنیا ہرگز نہیں ہے۔ رہبانیت کے معنی اللہ کا خوف ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے خوف سے ہر اس چیز سے کنارہ کشی کی جائے جو اللہ کی نافرمانی ہو یا اللہ کی نافرمانی کی طرف لے جاسکتی ہو یا قرب خدا کے راستے میں رکاوٹ بن سکتی ہو۔

ترک دنیا امیر المومنین کی نظر میں:

جہاں تک ترک دنیا کا تعلق ہے تو یہ اسلام میں کوئی ناپسندیدہ بات نہیں بلکہ انتہائی پسندیدہ ہے۔ اس بارے میں مولا علی علیہ السلام کے ارشادات بہت واضح ہیں۔ آپ نے دنیا سے کہا تھا:

طلقتک ثلاثا۔ اے دنیا میں تجھے تین طلاقیں دے چکا ہوں۔ (کلمات قصار 77)

طلاق دینے کا مطلب ترک کردینے کے سوا کیا ہوسکتا ہے؟ جب ایک شخص کسی عورت کو طلاق دے دیتا ہے تو کیا وہ اسے چھوڑ نہیں دیتا۔ نیز آپ نے فرمایا:

ان دنیا کم ھذہ لاھون عندی من ورقۃ فی فم جرادۃ تقضمھا

ترجمہ: میری نظر میں تمہاری دنیا اس پتے سے بھی زیادہ حقیر ہے جسے
ایک مکڑی اپنے منہ میں لے کر چبا رہی ہو۔ (نہج البلاغہ خطبہ 221)

ان دنیا کم ھذہ لاھون عندی من عراق خنزیر فی ید مجذوم

ترجمہ: تمہاری یہ دنیا میری نظر میں خنزیر کی انتڑیوں سے بھی زیادہ قابل نفرت
ہے جو کوڑھی کے ہاتھ میں ہوں۔ (نہج البلاغہ۔ حکمت 236)

فلتکن الدنیا فی اعینکم اصغر من حثالۃ القرظ و قراضۃ الجلم

ترجمہ: پس تمہاری نظر میں اس دنیا کو کیکر کے چھلکے کے تنکوں اور جانور کی پشم اتارتے وقت زمین
پر گر جانے والے بالوں سے بھی زیادہ حقیر ہونا چاہیے۔ (نہج البلاغہ خطبہ 32)

لکل منھما بنون فکونو من ابناء الآخرہ و لا تکونو ا ابناء الدنیا

ترجمہ: دنیا اور آخرت دونوں کے بیٹے ہیں، تم آخرت کے بیٹے بنو اور دنیا کے بیٹے نہ بنو۔
(نہج البلاغہ خطبہ 42)

اس بارے میں مولا علی علیہ السلام اور دیگر آئمہ علیہم السلام کے ارشادات اتنے زیادہ ہیں کہ اگر سب کو نقل کیا جائے تو بقول رومیؒ مثنوی ہفتاد من کاغذ شود۔ ان تمام ارشادات کا مقصد ترک دنیا کی ہی ترغیب ہے۔

ہاں ترک دنیا اور چیز ہے اور معاشرتی فرائض کو ترک کرنا اور چیز ہے۔ انسان ایک معاشرتی موجود ہے اور معاشرے کا فرد ہونے کی حیثیت سے اس پر کچھ معاشرتی فرائض عائد ہوتے ہیں جنہیں انجام دیئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ ترک دنیا کے باوجود وہ فرائض ضرور انجام دینے ہوتے ہیں۔ صوفیاء و عرفاء کے ہاں بھی ترک دنیا کا مطلب دنیوی لذائذ اور آرائش و زیبائش کا سرے سے ترک کر دینا نہیں ہے۔ ابن عربی کی دو بیویاں تھیں اور وہ صاحب اولاد تھے۔ رومی بھی شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے۔ اسی طرح دیگر بہت سے صوفیاء گھر بار اور بیوی بچوں والے تھے۔ ان میں سے بعض تاجر بھی تھے۔ رومی نے اپنے ایک مشہور شعر میں دنیا اور ترک دنیا کے معنی کو بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

چیست دنیا؟ از خدا غافل شدن　　نی طلاء و نقرہ و فرزند و زن　　(مثنوی دفتر اول)

دنیا کیا ہے؟ اللہ سے غافل ہو جانے کا نام دنیا ہے، دنیا سونے چاندی اور بیوی بچوں کا نام نہیں ہے۔

(بعض نسخوں میں دوسرا مصرعہ اس طرح ہے: نی قماش و نقرہ و میزان وزن)

رومی کے اس شعر کی رو سے اللہ سے غفلت کا نام دنیا ہے اور یہی وہ دنیا ہے جسے ترک کر دینا ضروری ہے۔ پس اگر اللہ سے غفلت کا نام دنیا ہے تو کیا ترک دنیا یعنی ترک غفلت واجب نہیں ہو گا؟ کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حکم نہیں دیا:

وَ لَاتَکُنْ مِنَ الْغَافِلِیْنَ۔ (اور غافلوں میں سے نہ ہو جاوٴ۔ اعراف:205)

رومی کے اس شعر اور مولا علی علیہ السلام کے مذکورہ بالا ارشادات میں کتنی گہری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

جو لوگ اندھا دھند مسیحی رہبانیت پر تنقید کرتے رہتے ہیں انہیں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ مسیحیت میں یہ رہبانیت کیسے آئی۔ رہبانیت سے متعلق سورۂ حدید کی مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں کتب تفسیر میں ایک روایت درج ہے۔ ہم اس روایت کو تفسیر المیز ان سے نقل کر رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ساتھ جا رہے تھے۔ آپ نے مجھ سے پوچھا: ابن مسعود جانتے ہو کہ نصاریٰ میں رہبانیت کہاں سے آئی؟ میں نے جواب دیا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ کے کچھ عرصہ بعد نصاریٰ پر جابر حکمرانوں کی حکومت قائم ہو گئی جو گناہوں کے مرتکب ہوتے تھے، پس اہل ایمان غضبناک ہو گئے اور ان جابر حکمرانوں کے مقابل میدان میں نکل آئے اور ان کے ساتھ تین جنگیں لڑیں لیکن ہر جنگ میں انہیں شکست ہوئی۔ جس کے بعد ان کی تعداد بہت کم رہ گئی اور وہ کمزور ہو گئے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر ہم روپوش نہ ہوئے تو یہ جابر حکمران ہمیں بھی ختم کر دیں گے اور دین کا نام ونشان مٹ جائے گا۔ پس وہ پہاڑوں کی غاروں میں پناہ گزین ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے ذکر میں مصروف ہو گئے۔ پھر آپ نے فرمایا: اے ابن مسعود جانتے ہو کہ میری امت کی رہبانیت کیا ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: میری امت کی رہبانیت ہجرت، جہاد، نماز، روزہ، حج اور عمرہ ہیں۔

اس حدیث سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں: ایک یہ کہ مسیحی علماء نے تقیہ کے طور پر گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔ تقیہ اسلام کے اہم احکام میں سے ہے اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ حضور نے جن چیزوں کو اپنی امت کی رہبانیت کہا ہے وہ دینی فرائض میں شمار ہوتی ہیں۔ بنا بریں یہ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ اسلام میں رہبانیت فرض ہے لیکن اس کا مزاج اور انداز اپنا ہے۔ نیز یہ کہ اسلام میں ترک دنیا بھی پسندیدہ ہے لیکن ترک دنیا کی آڑ میں معاشرتی فرائض کو ترک کرنے کی اجازت ہرگز نہیں ہے۔ جیسا کہ مولا علی علیہ السلام نے دنیا کو تین طلاقیں دے دی تھیں اور اس کے باوجود معاشرتی فرائض کی انجام دہی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔

ترک دنیا سے متعلق مزید ایک نکتہ قابل توجہ ہے۔ کسی بھی معاشرے کی تشکیل کے ابتدائی دور کے تقاضے ان ادوار کے تقاضوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں جب معاشرہ تشکیل پا کر مستحکم بنیادوں پر استوار ہو چکا ہوتا ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی، ان کی سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی طاقت بھی کم تھی۔ اس کے برعکس دشمنوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اور ان کی سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی طاقت بھی بہت زیادہ تھی۔ اس دور کی ضرورت تھی کہ مسلمان اپنی کم افرادی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی طاقت کا بھرپور اور مؤثر استعمال کریں۔ اگر اس دور میں مسلمان مسیحی رہبانیت جیسی رہبانیت اختیار کر لیتے تو ان کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور عددی قوت جو پہلے ہی کم تھی اور بھی کم ہو جاتی جو اس نوخیز مسلمان امت کے لیے بہت نقصان دہ ہو سکتی تھی۔ لہٰذا اس دور میں مسیحی رہبانیت (گوشہ نشینی) جیسی چیز کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ یہ ایسا ہی ہے کہ عام دنوں میں آرمی کے جوان روزانہ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی دیں، باقی وقت گھومیں پھریں، چھٹیاں بھی لیں اور چھٹیوں میں سیر سپاٹے بھی کریں۔ لیکن جب دشمن کی جارحیت کا خطرہ سامنے ہو تو ڈیوٹی بھی آٹھ گھنٹے کی نہیں بلکہ زیادہ ہو جاتی ہے اور چھٹیاں اور سیر سپاٹے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

ابتدائے اسلام کا دور بھی ایک جنگی دور تھا جس میں ضروری تھا کہ ہر مسلمان فرد اور مسلم معاشرہ اپنی طاقت کو بھرپور طور پر استعمال کرے۔ لیکن بعد کے ادوار میں جن میں آج کا دور بھی شامل ہے، مسلمانوں کی عددی قوت اور ان کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی طاقت میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا ہے اور

ان کے وجود کو استحکام حاصل ہو چکا ہے۔ ان حالات میں جبکہ مسلمانوں کا وجود مٹا دیئے جانے کے خطرے سے مکمل طور پر محفوظ ہے اگر کچھ افراد مکمل طور پر ترک دنیا اور گوشہ نشینی کا رویہ اپنا لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس لیے کہ معاشرتی اور قومی معاملات میں واجب کفائی انجام دینے والے افراد کی بہت زیادہ تعداد موجود ہے۔

یہاں ممکن ہے بعض احباب کی طرف سے یہ اعتراض ہو کہ اگر گوشہ نشینی اور ترک دنیا کی یہ گنجائش نکال لی جائے تو ہوسکتا ہے کہ سارے مسلمان یا مسلمانوں میں سے زیادہ تر لوگ اس راہ پر چل پڑیں اور پھر وہی صورت حال پیدا ہو جائے کہ واجبات کفائی انجام دینے کے لیے ضروری تعداد میں افراد باقی نہ بچیں اور مسلمانوں کے قومی اور معاشرتی امور خلل سے دوچار ہو جائیں۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ہندومت، بدھ مت اور مسیحیت اسلام سے بھی پہلے کے مذاہب ہیں۔ ان میں یہ گوشہ نشینی اور ترک دنیا نہ صرف جائز بلکہ انتہائی مقدس اور پسندیدہ مانی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے معاشروں میں یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا کہ سب لوگ یا زیادہ تر لوگ گوشہ نشین ہو جائیں اور قومی واجتماعی معاملات و معمولات خلل سے دوچار ہو جائیں۔

آخر میں راہب اور رہبانیت کے بارے میں ایک اور دلچسپ اور چشم کشا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

امام غزالی نے مراقبہ کے موضوع پر کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے جس کا نام ہے: ''مراقبہ کی حقیقت''۔ اس کتاب کے صفحہ 97 پر ایک عنوان ہے: راہب کون؟ اس عنوان کے تحت ایک حکایت درج ہے کہ ایک شخص عبدالواحد بن زید نامی سے مروی ہے کہ: ''میرا گزر ایک چین کے راہب کے پاس سے ہوا۔ میں نے اسے راہب کہہ کر آواز دی مگر وہ نہ بولا۔ پھر دوبارہ آواز دی مگر وہ نہ بولا۔ پھر میں نے پہلے سی آواز دی، پھر اس نے میری طرف سر نکالا اور بولا: اے صاحب! میں راہب نہیں ہوں۔ راہب وہ ہے جس میں خوف خداوندی ہو اور اس کی تعظیم کرے اور اس کی بلا پر صبر کرے، اس کی قضا پر راضی رہے، اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرے، اس کی عظمت کے سامنے تواضع کرے اور اس کی عزت کے مقابلے میں ذلیل رہے اور اپنے نفس کو اس کی قدرت کے حوالے کر دے اور اس کی ہیبت سے خضوع کرے اور اس کے حساب اور عذاب میں تامل کرے، دن کو روزہ رکھے، رات کو

عبادت کے لیے کھڑا رہے، دوزخ کو یاد رکھے، اللہ تعالیٰ سے مانگنا اس کو سونے نہ دے۔ راہب اسے کہتے ہیں۔ اور جو میرا حال پوچھوتو میں ایک باؤلا کتا ہوں، اپنے آپ کو اس عبادت خانے میں بند کرلیا ہے تا کہ لوگوں کو نہ کاٹوں''۔ میں نے پوچھا پھر کس چیز نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے علیحدہ کر رکھا ہے؟ پہچاننے کے بعد کیوں منحرف ہیں؟ اس نے کہا: ''برادر! خلق کو جو اللہ تعالیٰ سے دور کیا ہے تو صرف دنیا کی محبت وزینت نے کیا ہے۔ دنیا گناہوں اور معاصی کی جگہ ہے۔ جو ہوشیار ہے وہ دنیا کو اپنے دل سے پھینک دے اور اللہ تعالیٰ کے روبرو اپنے گناہوں سے توبہ کرے اور ایسی باتوں پر متوجہ ہو جو اللہ تعالیٰ کے قریب کریں یعنی جن سے قرب حق حاصل ہو''۔

تصوف وعرفان سے ناواقفیت:

ہم یہ بات پہلے بیان کر چکے ہیں کہ علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے پرویز کی کتاب ''تصوف کی حقیقت'' کی نقل مار کر اور اس میں تشیع کا تڑکا لگا کر تصوف وعرفان کی رد میں کتاب تو لکھ دی لیکن تصوف و عرفان کی حقیقت سے مکمل طور پر ناآشنا ہیں۔ چنانچہ اقامۃ البرہان کے صفحہ 102 پر بظاہر بہت معصومانہ مگر حقیقت میں نہایت مغالطہ انگیز انداز میں تحریر فرماتے ہیں:

''اگر عرفان سے خدا و مصطفی اور آئمہ ہدیٰ اور دین مصطفی کی معرفت مراد ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ یہ مقصد سرکار محمد وآل محمد علیہم السلام کے ذریعہ سے بآسانی حاصل ہوسکتا ہے یا صوفیاء کے توسط سے؟ اور اگر یہ معلوم کرنا ہے کہ توحید کا مقام اور نبی وامام کی شان کیا ہے؟ تو اس کے لیے ہمیں قرآن مجید، اصول کافی، نہج البلاغہ اور صحیفہ کاملہ کا مطالعہ کرنا پڑے گا یا صوفی حلاج یا ابن عربی کی فصوص الحکم جو کہ بقول ڈاکٹر اقبال اور جہاں تک مجھے معلوم ہے فصوص الحکم میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ (اقبال نامہ جلد 1 صفحہ 44) اور فتوحات مکیہ یا غزالی کی احیاء العلوم کا مطالعہ کرنا پڑے گا''۔

علامہ نجفی دام ظلہ کی یہ تحریر اور اس سے ملتی جلتی باتیں درحقیقت ان لوگوں کی طرف سے کی جاتی ہیں جو جانتے ہی نہیں کہ تصوف اور عرفان کا موضوع اور صوفی وعارف کا مقصد کیا ہے۔ علامہ محمد حسین نجفی صاحب دام ظلہ کی کتاب کا یہ اقتباس اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ تصوف اور عرفان کے موضوع اور مبادیات تک سے ناواقف ہیں۔ یہ تحریر اور یہ انداز بیان بھی سوائے مغالطہ انگیزی کے کچھ نہیں ہے۔ جو

بات علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے کی ہے اگر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر کے اس طرح کہا جائے:

''اگر یہ معلوم کرنا ہے کہ توحید کا مقام اور نبی و امام کی شان کیا ہے؟ تو اس کے لیے ہمیں قرآن مجید، اصول کافی، نہج البلاغہ اور صحیفہ کاملہ کا مطالعہ کرنا پڑے گا یا علامہ محمد حسین نجفی صاحب کی احسن الفوائد، اصول الشریعہ، سعادت الدارین اور تجلیات صداقت کا مطالعہ کرنا پڑے گا''۔ تو علامہ نجفی صاحب کیا جواب دیں گے؟ جو جواب ان کا ہے وہی جواب ان کے اس سوال کا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کے اس بظاہر معصومانہ اور درحقیقت مغالطہ انگیز بیان کا تجزیہ کریں ایک اہم مسئلہ پر اختصار کے ساتھ گفتگو ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس مسئلہ کو فلسفی مباحث میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ فارسی میں اسے ''شناخت شناسی'' کہا جاتا ہے۔ عربی میں اسے نظریۃ المعرفہ کہا جاتا ہے، اردو میں ''نظریہ علم'' اور انگریزی میں Epistemology کہا جاتا ہے۔ اس مسئلہ میں اس بات پر بحث کی جاتی ہے کہ آیا انسان حقیقت کا علم حاصل کرسکتا ہے یا نہیں؟ اگر کرسکتا ہے تو علم حاصل کرنے کے ذرائع کون کون سے ہیں اور ان کے ذریعے حاصل ہونے والے علم اور معلومات کی قدر و قیمت کیا ہے۔

اس مسئلہ پر ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان سرے سے حقیقت کا علم حاصل ہی نہیں کرسکتا اور انسان کے پاس جو کچھ بھی معلومات ہیں ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ وہمیات سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔ یہ قدیم یونان کے سوفسطائیوں کا نظریہ تھا۔ اس کے برعکس دوسرا نظریہ یہ ہے کہ انسان حقیقت کا علم حاصل کرسکتا ہے۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ آتا ہے کہ علم حاصل کرنے کے ذرائع کیا ہیں۔ ایک مکتبہ فکر کا کہنا ہے کہ انسان حقیقت کا علم صرف حواس اور تجربے سے حاصل کرسکتا ہے۔ جو کچھ حواس اور تجربے کی گرفت میں آسکتا ہے وہ صحیح اور قابل قبول ہے اور جو کچھ حواس اور تجربے کی سرحد سے باہر ہے اسے جاننے کا کوئی طریقہ موجود نہیں ہے۔ اس مکتب کو تجربیت (Empiricism) کہا جاتا ہے۔

دوسرا مکتبہ فکر یہ کہتا ہے کہ مادی دنیا کے حقائق کو تو حواس کے ذریعے جانا جاسکتا ہے لیکن جو حقائق حواس اور تجربے کی حدود میں نہیں آتے عقل کے ذریعے ان کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ فلاسفہ کا نظریہ ہے۔ اس کے بعد ایک اور نظریہ یہ ہے کہ مادی اشیاء کا علم تو حواس اور تجربے سے حاصل کیا جاسکتا ہے مگر ماورائے مادہ کا علم، جو عقل کے ذریعے حاصل کیا جائے وہ قابل اعتماد نہیں ہے، بلکہ اس کا صحیح راستہ یہ ہے کہ

انسان اپنے باطن کو پاک کرے، اور جب انسان باطن کو پاک کر لے تو حقیقت کا علم اس کے دل پر اس طرح طلوع ہوتا ہے جیسے مشرق سے سورج طلوع ہوتا ہے۔ اس مکتب کو مکتب اشراق کہا جاتا ہے۔ فلاسفہ عقلی استدلال پر بھروسہ کرتے ہیں جب کہ عرفاء وصوفیاء عقلی استدلال کی بجائے اشراق یا باطنی مشاہدے پر اعتماد کرتے ہیں۔ مسلم عرفاء میں شیخ شہاب الدین اشراقی کو اس مکتب کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

رومی نے مثنوی میں عقلی استدلال کو لکڑی کی ٹانگ قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

پای استدلالیان چوبین بود　　　　پای چوبین سخت بی تمکین بود

ترجمہ: عقلی استدلال سے کام لینے والوں کی ٹانگ لکڑی کی ٹانگ
ہوتی ہے اور لکڑی کی ٹانگ سخت نا قابل اعتبار ہوتی ہے۔

اردو شاعر اکبر الہ آبادی نے اس بات کو اس طرح بیان کیا ہے:

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں　　　　ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

بوعلی سینا فلسفی تھے اور عقلی استدلال کے حامی تھے۔ ان کے دور میں ایک معروف عارف تھے ابوسعید ابوالخیر، جو اشراق اور باطنی شہود کے قائل تھے۔ کتاب اسرار التوحید فی مقامات شیخ ابی سعید میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ایک بار بوعلی سینا ابوسعید ابوالخیر سے ملاقات کے لیے آئے۔ تین دن بند کمرے میں ان کی بات چیت جاری رہی۔ اس دوران وہ صرف نماز کے لیے باہر نکلتے تھے۔ تین دن کے بعد ملاقات ختم ہوئی اور بوعلی سینا واپس چلے گئے۔ ان کے شاگردوں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ابوسعید ابوالخیر کو کیسا پایا؟ بوعلی سینا نے جواب دیا: جو کچھ میں جانتا ہوں ابوسعید اسے دیکھتے ہیں۔ یہی سوال ابوسعید ابوالخیر کے شاگردوں نے ان سے کیا کہ آپ نے بوعلی سینا کو کیسا پایا؟ انہوں نے جواب دیا کہ جو کچھ میں دیکھتا ہوں وہ اسے جانتا ہے۔

ان دو مکاتب فکر کے اس فرق کو علامہ اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے:

بوعلی اندر غبار ناقہ گم　　　　دست رومی پردہ محمل گرفت
این فروتر رفت تا گوہر رسید　　　　آن بہ گردابی چو خس منزل گرفت　　(پیام مشرق)

ترجمہ: بوعلی سینا تو اونٹنی کے قدموں سے اڑنے والے گردوغبار میں گم

ہوکررہ گیا جبکہ رومی کا ہاتھ محمل کے پردے تک پہنچ گیا۔

یہ (یعنی رومی) سمندر کی تہہ میں اتر گیا اور موتی تک پہنچ گیا جب کہ وہ (یعنی بوعلی سینا)

بھنور میں پھنسے ہوئے تنکے کی طرح گرداب کو ہی منزل سمجھ بیٹھا۔

ایک اور مقام پر علامہ اقبال فرماتے ہیں:

مقام ذکر کمالات رومی وعطار   مقام فکر مقالات بوعلی سینا

مقام فکر ہے پیمائش زمان ومکان   مقام ذکر ہے سبحان ربی الاعلی (ضرب کلیم: ذکروفکر)

علامہ اقبال یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ فکر جو کہ عقل کا عمل ہے، وہ زمان ومکان کی حدودوں میں محدود ہے، اس سے باہر نہیں جاسکتی جب کہ ذکر جو کہ دل کا عمل ہے، وہ سبحان ربی الاعلیٰ کے مقام پر جا پہنچتا ہے۔

بوعلی سینا جس فلسفی مکتب کی نمائندگی کرتے تھے اسے فلسفہ مشاء کہا جاتا ہے۔ مشائین اور اہل اشراق کے درمیان طویل عرصہ تک ایک محاذ آرائی کی کیفیت جاری رہی۔ یہاں تک کہ ملاصدرا آ گئے۔ انہوں نے اپنے فلسفہ میں عقلی استدلال اور باطنی اشراق دونوں کی اہمیت کو واضح کیا اور یہ ثابت کیا کہ حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لیے ان دونوں کا ہونا ضروری ہے۔ عقلی استدلال اور باطنی اشراق ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ اس لحاظ سے ملاصدرا کے فلسفہ کو فلسفہ مشاء اور فلسفہ اشراق پر برتری اور تفوق حاصل ہے۔ ملاصدرا کے فلسفے کی اسی برتری کی وجہ سے ان کے فلسفہ کو حکمت متعالیہ کہا جاتا ہے۔ جس کی تفصیل ان کی آٹھ جلدوں پر مشتمل کتاب اسفار میں موجود ہے۔

اب آتے ہیں علامہ نجفی صاحب کے اس مغالطہ انگیز بیان کے تجزیئے کی طرف۔ یقیناً اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین کی معرفت قرآن مجید اور احادیث نبوی وارشادات معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین سے بہتر کسی اور جگہ سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اس بات کو سب صوفیاء اور عرفاء بھی تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ صوفیاء کے اقوال میں یہ بات بیان ہوچکی ہے کہ تصوف کا علم وقرآن وسنت پر مبنی ہے۔ لیکن ذرا غور فرمائیں:

ایک چھ سات سال کا بچہ ہے جسے اس کے والدین نے سورۂ فاتحہ اور سورۂ توحید حفظ کرا دی اور اس کا ترجمہ بھی یاد کروا دیا۔ اب اس بچے کو سورۂ فاتحہ اور سورۂ توحید کی روشنی میں معلوم ہو گیا کہ اللہ موجود ہے، وہ ایک ہے، وہ بے نیاز ہے، اسے کسی نے جنم نہیں دیا نہ اس نے کسی کو جنم دیا، کوئی اس کے برابر نہیں ہے۔ وہ عالمین کا رب ہے، رحمن ہے جو سب پر رحم کرتا ہے اور رحیم ہے جو مومنین پر خصوصی رحمت فرماتا ہے۔ قیامت کے دن اسی کی حاکمیت ہوگی۔ ہم سب اسی کے بندے ہیں اور اسی کی مدد کے محتاج ہیں۔ اس کی بندگی ہی زندگی گزارنے کا اور نجات پانے کا سیدھا راستہ ہے جس پر چل کر انسان اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی خصوصی نعمتوں کا حقدار ٹھہرتا ہے اور جو اس راستے سے ہٹ کر کوئی راستہ اختیار کرے وہ گمراہ ہو جاتا ہے اور اللہ کے غضب کا مستحق قرار پاتا ہے۔

غور کیا جائے تو کس قدر کامل اور اکمل ہے یہ معرفت۔ لیکن یہ سات سال کا بچہ، جس نے رٹا لگا کر ان تمام باتوں کو سن کر یاد کر لیا ہے اور ان کو جان لیا ہے کیا ان سب باتوں کی عقلی معرفت بھی رکھتا ہے؟ کیا اس علم و معرفت کی بنیاد پر وہ کسی منکر خدا سے بحث کر کے عقلی دلائل سے ان سب باتوں کو ثابت کر سکتا ہے؟ دہریوں کے شبہات کا جواب دے سکتا ہے؟ جواب بالکل واضح ہے کہ وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کی یہ معرفت محض سنی سنائی معرفت ہے جسے معرفت مسموع کہا جاتا ہے۔

یہ بچہ حصول علم کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے عقل و شعور و ادراک کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے۔ اب وہ ان سب باتوں کی حقیقت کو عقلی دلائل سے بھی سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ان سب باتوں کو عقلی دلائل کے ساتھ کسی بھی فورم پر بیان کرنے اور ثابت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اب وہی معرفت جو اس نے قرآن کی روشنی میں سنی سنائی کی بنیاد پر حاصل کی تھی، عقلی دلائل سے بھی آراستہ ہو گئی ہے۔ اب اسے معرفت معقول یا معرفت عقلی کہیں گے جو معرفت سمعی یا معرفت مسموع سے افضل ہے۔

اس دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو معرفت مسموع رکھتے ہیں، عقلی طور پر اسے سمجھتے بھی ہیں لیکن کیا ضروری ہے کہ یہ معرفت ان کے دلوں میں بھی داخل ہو گئی ہو؟ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ واضح طور پر ایسی ہی معرفت رکھنے والوں کو جنہوں نے کسی مدرسے یا حوزہ سے نہیں بلکہ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم سے یہ معرفت حاصل کی تھی، یہ کہہ رہا ہے کہ:

لَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ

ترجمہ: ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ (حجرات:14)

اسی بات کو علامہ اقبال نے اس طرح سے بیان فرمایا ہے:

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل　　　دل ونگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(ضرب کلیم: تصوف)

اس معرفت مسموع اور معرفت معقول کے بعد معرفت کا ایک اور درجہ آتا ہے جسے معرفت شہودی یا معرفت مشہود کہا جاتا ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام دعائے عرفہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس طرح مناجات کرتے نظر آتے ہیں:

الغیرک من الظهور ما لیس لک، متی غبت حتیٰ تحتاج الیٰ دلیل تدل علیک و متی بعدت حتیٰ تکون الآثار هی التی توصل الیک، عمیت عین تراک و لا تزال علیها رقیبا

ترجمہ: اے میرے رب! کیا کوئی چیز تجھ سے بڑھ کر ظاہر وآشکار ہے؟ تو کب پنہاں تھا کہ تجھے ایسی دلیل کی ضرورت ہوتی جو تیری طرف رہنمائی کرے اور تو کب دور تھا کہ آثار تجھ تک پہنچانے والے ہوتے، اندھی ہے وہ آنکھ جو تجھے نہیں دیکھتی جبکہ تو ہر وقت اس پر نگران ہے۔ (بحار142:64)

امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا گیا تھا:

هل رایت ربک (کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟) تو آپ نے جواب دیا:

ویلک ما کنت اعبد ربا لم اره

ترجمہ: تجھ پر افسوس ہے، میں اس رب کی عبادت نہیں کرتا جسے دیکھا نہیں پھر آپ نے فرمایا کہ اسے ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ دل ایمان کی حقیقت سے اسے دیکھتے ہیں۔

(اصول کافی جلد 1 باب ابطال رؤیت حدیث 6)

بالفاظ دیگر جب ایمان کی حقیقت دل کو منور کردیتی ہے تو دل ایمان کے نور سے اللہ کو دیکھنے لگتا ہے۔اس معرفت کو معرفت شہودی کہتے ہیں۔ سات سالہ بچے والی مثال میں پہلے سورۂ فاتحہ اور سورۂ توحید سن کر معرفت مسموع حاصل کی، پھر عقل کی روشنی میں انہیں حقائق کی معرفت معقول حاصل کی۔ پھر ایمان کی روشنی میں انہی حقائق کا دل کی آنکھ سے مشاہدہ کیا تو معرفت شہودی حاصل ہوگئی۔

تصوف اور عرفان کا پہلی دو قسم کی معرفت سے کوئی سروکار نہیں۔پہلی قسم کی معرفت یعنی معرفت مسموع مولوی کی آخری منزل ہوتی ہے۔ یہ مولوی کی بس کا آخری سٹاپ ہوتا ہے۔ دوسری معرفت، یعنی عقلی دلائل و براہین پر مبنی معرفت، فلسفی کی منزل مقصود ہوتی ہے۔لیکن جب صوفی و عارف معرفت کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد معرفت کی یہ دو قسمیں نہیں ہوتی ہیں بلکہ اس سے مراد معرفت شہودی ہوتی ہے۔ اسلام بھی اسی معرفت کا تقاضا کرتا ہے۔اس لیے ہر مسلمان اپنے ایمان کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

اشہدان لا الہ الا اللہ (میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے)

حجۃ الاسلام حسین انصاریان عرفان اسلامی کی پہلی جلد میں صفحہ 10 پر عرفان کی تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں:

''عرفان بہ معنی شناخت و در اصطلاح معرفت قلبی کہ از طریق کشف و شہود و نہ از بحث و استدلال حاصل می شود و عارف کسی است کہ از خودشناسی نیل بہ خداشناسی دارد۔''

ترجمہ:'' عرفان کے معنی ہیں شناخت اور اصطلاح میں اس سے وہ معرفت مراد ہے جو کشف اور شہود کے ذریعے حاصل ہوتی ہے نہ کہ بحث و استدلال کے ذریعے، اور عارف وہ ہوتا ہے جو خود شناسی کے راستے سے خدا شناسی تک پہنچتا ہے''۔

یہ معرفت شہودی ہے جو عرفان و تصوف کا موضوع ہے اور عرفان و تصوف میں قرآن و حدیث کی روشنی میں اسی معرفت اور اس کے حصول کے راستے اور طریقے سے بحث کی جاتی ہے۔

عرفان، مولا علی اور رومی:

مولا علی (علیہ السلام) نے فرمایا کہ میں نے اس رب کی عبادت نہیں کی جسے دیکھا نہیں۔ مولا علی (علیہ السلام) کی اسی بات کو سامنے رکھتے ہوئے رومیؒ مولا علی (علیہ السلام) کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں:

اے علی کہ جملہ عقل و دیدہ ای　　　　شمہ ای وا گو از آنچہ دیدہ ای

ترجمہ: اے علی! اے وہ ذات جو صرف عقل و بصیرت ہے، یعنی ہر قسم کی خواہشات نفسانی سے پاک ہے، جو کچھ آپ نے دیکھا ہے، اس کی ایک جھلک ہمارے لیے بیان فرما دیں۔

پھر وہ خود ہی اس معرفت کے راز پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ معرفت شہودی کسی کے بتانے یا پڑھنے پڑھانے سے یا عقلی استدلال سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ پھر جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کیسے کی جائے تو اس مقام پر پھر وہ مولا علی (علیہ السلام) کو ہی نمونہ اور رہنما قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

از علی آموز اخلاص عمل　　　　شیر حق را دان منزہ از دغل

در غزا بر پہلوانی دست یافت　　　　زود شمشیری بر آورد و شافت

او خدو انداخت بر روئے علی　　　　افتخار ہر نبی و ہر ولی

آن خدو زد بر رخی کہ روی ماہ　　　　سجدہ آرد پیش او در سجدہ گاہ

درزمان انداخت شمشیر آن علی　　　　کرد او اندر غزایش کاہلی

گشت حیران آن مبارز زین عمل　　　　وز نمودن عفو و رحم بی محل

گفت بر من تیغ تیز افراشتی　　　　از چہ افکندی مرا بگذاشتی

گفت من تیغ از پی حق میزنم　　　　بندہ حقم نہ مامور تنم

شیر حقم نیستم شیر ہوای　　　　فعل من باشد بردینم گواہ

(مثنوی معنوی دفتر اول)

ترجمہ: اخلاص عمل سیکھنا ہے تو علی سے سیکھو، اللہ کے شیر کو ہر قسم کی آلائش اور کھوٹ سے پاک سمجھو۔

ایک جنگ میں انہوں نے ایک پہلوان کو پچھاڑ دیا، انہوں نے فوراً تلوار نکالی اور تیزی سے آگے بڑھے۔

اس نے علی (علیہ السلام) کے چہرے پر تھوک دیا، وہ علی جو ہر نبی اور ہر ولی کا سرمایہ افتخار ہیں۔

اس نے اس چہرے پر تھوک دیا جس چہرے کو چاند سجدہ کرتا ہے۔

علی علیہ السلام نے فوراً تلوار رکھ دی اور اس سے لڑنے میں سست ہو گئے۔

وہ جنگجو آپ کے اس عمل اور بے موقع عفو و رحم پر حیران ہوا۔

اس نے پوچھا: آپ نے تلوار اٹھائی اور پھر اسے رکھ دیا اور مجھے چھوڑ دیا۔

حضرت علی نے جواب دیا: میں اللہ کے لیے تلوار چلاتا ہوں،

میں اللہ کا بندہ ہوں اپنے جسم کا محکوم نہیں ہوں۔

میں اللہ کا شیر ہوں، اپنی خواہش نفس کا شیر نہیں ہوں اور میرا فعل میرے دین کا گواہ ہے۔

رومی نے یہ پورا واقعہ دفتر اول میں شعر نمبر 3721 سے شعر نمبر 4000 تک، 280 اشعار میں بیان کیا ہے۔ ہم نے ان میں سے چیدہ چیدہ نو شعر نقل کیے ہیں۔ ان اشعار میں رومی مولا علی (علیہ السلام) کی یہ خصوصیات بیان کر رہے ہیں:

- ☆ مولا علی خالص عقل و بصیرت ہیں۔
- ☆ مولا علی اللہ تعالیٰ کے خالص اور مخلص بندے ہیں۔
- ☆ مولا علی ہر قسم کے کھوٹ اور آلائش سے پاک اور منزہ ہیں۔
- ☆ مولا علی ہر نبی کا فخر ہیں۔
- ☆ مولا علی ہر ولی کا فخر ہیں۔
- ☆ مولا علی کا چہرہ وہ چہرہ ہے جسے چاند سجدہ کرتا ہے۔
- ☆ مولا علی اللہ کے بندے ہیں۔
- ☆ مولا علی نفس کا بندہ نہیں ہیں۔
- ☆ مولا علی اللہ کا شیر ہیں۔
- ☆ مولا علی اپنے نفس کا شیر نہیں ہیں۔

مولا علی کے یہ فضائل تو ان نو اشعار میں بیان ہوئے ہیں۔ اگر ان سب اشعار میں بیان شدہ

مولاعلی کے فضائل کی فہرست بنائی جائے تو بہت لمبی فہرست بن جائے گی۔ تفصیل کے خواہشمند مومنین و مومنات مثنوی معنوی کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمالیں۔

رومیؒ کے ان اشعار کی روشنی میں عرفان وتصوف کا خلاصہ یہ ہے کہ تصوف اللہ تعالیٰ کی معرفت شہودی حاصل کرنے کا نام ہے۔ یہ معرفت شہودی سن کر یا پڑھنے لکھنے سے یا عقلی بحث و استدلال سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنے کا ہنر سیکھنا ہو تو مولاعلی (علیہ السلام) سے سیکھو۔

از علی آموز اخلاص عمل

اگر بات کو مزید سادہ الفاظ میں یا ایک نقشہ کی صورت میں بیان کیا جائے تو یہ صورت سامنے آتی ہے:

☆ تصوف کی منزل : اللہ تعالیٰ کی شہودی معرفت

☆ اس منزل تک جانے والا راستہ: اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی

☆ اس راستے سے گزار کر اس منزل تک لے جانا والا رہنما: مولاعلی (سلام اللہ علیہ)

جناب رومی کے ان اشعار کو دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہے کہ صوفیاء کے ہاں عبادت کی کوئی اہمیت نہیں ہے، وہ واجبات ومحرمات کی پابندی کو لازم نہیں سمجھتے تو یہ کس قدر جہالت کی بات ہوگی۔ علاوہ بریں رومی کے ان اشعار کو دیکھ کر بھی اگر کوئی یہ کہے کہ سب صوفیاء اہل بیت کے اور مولاعلی (علیہ السلام) کے دشمن ہیں اور رومی بھی اہل بیت کے دشمن اور مولاعلی (علیہ السلام) کے دشمن تھے تو اس کا فیصلہ ہم قارئین محترم کی عقل پر چھوڑ دیتے ہیں۔

رومی اور ولایت علی:

اس مقام پر یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ولایت علی (علیہ السلام) کے بارے میں رومیؒ کے نظریہ پر روشنی ڈال دی جائے تا کہ حقیقت مزید واضح ہو جائے۔ مثنوی کے دفتر پنجم میں رومی ایک حکایت درج کرتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک کمینے انسان کی فریب کار حسین عورت شہر کے قاضی کو اپنے دام فریب میں گرفتار کر لیتی ہے۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق ایک رات وہ قاضی کو گھر بلا لیتی ہے۔

جب وہ اور قاضی باتیں کر رہے ہوتے ہیں تو پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق اچانک اس کا شوہر آجاتا ہے۔قاضی کے لیے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔وہ وہاں موجود لکڑی کے ایک صندوق میں چھپ جاتا ہے۔وہ شخص اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ تو ہمیشہ مجھ سے جھگڑتی رہتی ہے کہ میں تیری ضروریات پوری نہیں کرتا اور لوگ بھی سمجھتے ہیں کہ شاید یہ صندوق سونے چاندی سے بھرا ہوا ہے اور میں کوئی بہت ہی بخیل آدمی ہوں جو اپنی بیوی کی ضروریات تک پوری نہیں کرتا، حالانکہ یہ صندوق ریا کار عبادت گزاروں کی طرح سے ہے، بظاہر بہت خوبصورت مگر اندر سے لعنت سے بھرا ہوا۔ میں صبح اس صندوق کو چوک میں لے جا کر جلا دوں گا۔نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

صبح ہوتے ہی وہ شخص ایک مزدور کو بلالاتا ہے اور صندوق اٹھوا کر اسے کہتا ہے کہ تو اس صندوق کو لے کر فلاں چوک پر پہنچ، میں آرہا ہوں۔جب مزدور صندوق لے کر چلتا ہے تو اندر سے قاضی اسے آواز دیتا ہے۔مزدور جب دیکھتا ہے کہ اندر سے کوئی آواز دے رہا ہے تو پوچھتا ہے کہ کون ہو اور کیا ماجرا ہے؟ قاضی کہتا ہے کہ میں اس شہر کا قاضی ہوں، فوراً کسی کو عدالت میں بھیجو تا کہ میرے نائب کو یہاں بلالائے۔مزدور ایسا ہی کرتا اور ایک شخص کو قاضی کے نائب کے پاس بھیج دیتا ہے۔قاضی کا نائب آتا ہے، قاضی اسے کہتا ہے کہ ہر قیمت پر یہ صندوق خرید لو تا کہ میری جان اور عزت دونوں بچ جائیں۔مختصر یہ کہ قاضی کا نائب وہ صندوق ایک ہزار دینار میں اس شخص سے خرید لیتا ہے اور گھر لے جا کر اس صندوق میں سے قاضی کو نکال لیتا ہے۔اس طرح قاضی کی عزت اور زندگی دونوں بچ جاتے ہیں۔

یہ حکایت بیان کرنے کے بعد رومیؒ کہتے ہیں کہ وہ فریب کار حسین عورت دنیا ہے۔دنیا کا ہر انسان دنیا کی خوبصورتی کے فریب میں آکر اس قاضی کی طرح اپنی اپنی نفسانی خواہشات کے صندوق میں بند ہے اور اس صندوق کی قسمت یہ ہے کہ اسے آگ میں یعنی جہنم کی آگ میں جلا دیا جائے۔خوش نصیب ہے وہ انسان جس کا کوئی مددگار اس کو اس صندوق سے آزاد کرالے۔انبیاء و اولیاء کا کام انسانوں کو اس صندوق سے آزادی دلانا ہوتا ہے۔اس کے بعد رومیؒ کہتے ہیں:

زین سبب پیغمبر با اجتہاد　　　　اسم خود و آن علی مولا نہاد

ترجمہ: اسی لیے لوگوں کی ہدایت اور آزادی کے لیے کوشش اور جدوجہد

کرنے والے پیغمبر اکرم نے اپنا اور علی کا نام مولا رکھا۔

گفت ہرکو را منم مولا و دوست　　　ابن عم من علی مولای اوست

ترجمہ: اور کہا جس جس کا میں مولا ہوں میرے چچا کا بیٹا علی بھی اس کا مولا ہے۔

کیست مولا؟ آنکہ آزادت کند　　　بند رقیت ز پایت وا کند

ترجمہ: مولا کون ہوتا ہے؟ مولا وہ ہوتا ہے جو تمہیں نفس کی قید سے آزاد کرے،

تمہارے پاؤں میں پڑی ہوئی نفس کی غلامی کی زنجیروں کو کھول دے۔

قارئین محترم! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ رومیؒ کی نظر میں فلسفہ ولایت کیا ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مولا علی علیہ السلام کی ولایت کے فلسفہ کو کس طرح بیان کر رہے ہیں۔

رومی کے بارے میں علامہ نجفی کی ناواقفیت:

صفحہ 109 پر علامہ نجفی دام ظلہ رومی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ رومی جبری العقیدہ تھے۔ حالانکہ رومی ہرگز جبری العقیدہ نہیں تھے، جبر و اختیار کے بارے میں ان کا نظریہ ملاحظہ فرمائیں:

کرد ما و کرد حق ہر دو ببین　　　کرد ما را ہست دان پیدا است این

ہمارے فعل اور حق تعالیٰ کے فعل دونوں کو حق سمجھو،

ہمارے فعل کو بھی موجود جانو، یہ بات واضح اور عیاں ہے۔

گر نباشد فعل خلق اندر میان　　　پس مگو کس را چرا کردی چنان

اگر مخلوق کا کوئی فعل نہ ہو تو پھر کسی کو یہ نہ کہو کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟

خلق حق افعال ما را موجد است　　　فعل ما آثار خلق ایزد است

اللہ تعالیٰ کی خالقیت ہمارے افعال کی موجد ہے

اور ہمارا فعل اللہ کی خالقیت کے آثار میں سے ہے۔

پھر ایک خوبصورت تمثیل کے ذریعے اس کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں:

یک مثال ای دل پی فرقی بیار   تا بدانی جبر را از اختیار

جبر و اختیار کا فرق سمجھنے کے لیے اے دل اس مثال پر غور کرو تا کہ تم جبر اور اختیار میں تمیز کر سکو۔

دست کان لرزان بود از ارتعاش   وانکہ دستی را تو لرزانی ز جاش

ایک شخص کا ہاتھ رعشہ کی بیماری کی وجہ سے لرزتا ہے اور ایک یہ کہ تم اپنے ہاتھ کو خود لرزانے لگو

ہر دو جنبش آفریدہ حق شناس   لیک نتوان کرد این با آن قیاس

ہاتھ کی یہ دونوں حرکتیں اللہ کی مخلوق ہیں لیکن ان دونوں کو ایک نہیں کہا جا سکتا۔

زین پشیمانی کہ لرزانیدیش   چون پشیمان نیست مرد مرتعش

تم اپنا ہاتھ لرزانے پر پشیمان ہو سکتے ہو جبکہ رعشہ کی بیماری کی وجہ

سے جس کا ہاتھ لرزتا ہے اسے کوئی پشیمانی نہیں ہوتی۔

امر و نہی و خشم و تشریب و عتیب   نیست جز مختار را ای پاک جیب

امر، نہی، غصہ، سزا اور عتاب صرف اسی کو کیا جا سکتا ہے جو فاعل مختار ہو۔

در تردد ماندہ ایم اندر دو کار   این تردد کی بود بی اختیار

بعض اوقات ہم دونوں کاموں کے درمیان شک و تردید اور تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں،

اگر ہم اختیار نہ رکھتے ہوں تو یہ تذبذب کیسا؟

این کنم یا آن کنم این کی گود   کہ دو دست و پای او بستہ بود

جس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوں وہ کب ایسی بات کہہ سکتا ہے

کہ میں یہ کام کروں یا وہ کام کروں۔

مزید کہتے ہیں:

اینکہ فردا این کنم یا آن کنم   این دلیل اختیار است ای صنم

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ کل میں یہ کام کروں گا یا وہ کام کروں گا، یہ ہمارے اختیار کی دلیل ہے۔

اگر کوئی شخص سرسری نظر سے بھی ایک بار مثنوی کا مطالعہ کر لے تو وہ ان اشعار سے بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ جبر و اختیار میں رومی کا نظریہ کیا ہے۔علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کا رومی کو جبری العقیدہ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے رومی کو پڑھا ہی نہیں ہے۔

محمود شبستری اور بت پرستی

تصوف کے مخالفین کے ہاتھ میں ایک اور ہتھکنڈا شیخ محمود شبستری کا یہ شعر ہے:

مسلمان گر بدانستی کہ بت چیست　　　بدانستی کہ دین در بت پرستی است

(ترجمہ: اگر مسلمان کو علم ہو جائے کہ بت کیا ہے تو وہ جان لے کہ دین بت پرستی میں ہی ہے)

اس سے پہلے کہ ہم اس شعر پر بات کریں محمود شبشتری اور ان کی کتاب گلشن راز کے بارے میں چند بنیادی باتوں کا تذکرہ ضروری ہے۔محمود شبستری کا تعلق تبریز سے تھا۔خراسان کے والی امیر حسینی ہروی (متوفا718ہجری) نے ایک خط میں اشعار کی صورت میں معرفت الٰہی ،تصوف، سیر و سلوک اور بعض دیگر موضوعات کے بارے اٹھارہ سوال تبریز کے صوفیاء کو بھیجے۔جب قاصد یہ خط لے کر تبریز کی خانقاہ میں صوفیاء و عرفا کے پاس پہنچا تو اس نے بلند آواز سے ان کے سامنے یہ اشعار پڑھے۔حاضرین میں شیخ محمود شبستری اور ان کے استاد بہاء الدین تبریزی بھی موجود تھے۔انہوں نے شیخ محمود شبستری کو ان سوالات کا جواب دینے کا حکم دیا۔چنانچہ شیخ محمود شبستری نے اسی محفل ان سوالوں کے جوابات شعر کی صورت میں بیان کیے۔گلشن راز رومیؒ کی مثنوی معنوی کی طرح علماء و عرفاء میں بہت مقبول ہے اور مثنوی معنوی کی طرح اس کی بھی بہت سی شروح لکھی گئی ہیں۔علامہ اقبال کی کتابوں میں سے ایک کتاب کا نام گلشن راز جدید ہے۔اس میں علامہ اقبال نے انہی اٹھارہ سوالوں کے جواب اپنے انداز میں دیئے ہیں۔

ہم یہاں ان اٹھارہ سوالوں میں سے پہلے دو سوال اور ان کے جواب میں دیئے گئے چند اشعار نقل کرتے ہیں تا کہ قارئین کو اندازہ ہو جائے کہ گلشن راز کیا ہے اور شیخ محمود شبستری کیا چیز ہیں۔پہلا سوال انسانی سوچ کے بارے میں ہے:

نخست از فکر خویشم در تحیر   چہ چیز است آنچہ خوانندش تفکر

ترجمہ: سب سے پہلے میں اپنی سوچ کے بارے میں حیرت میں ہوں،

وہ چیز جسے تفکر یعنی سوچ کہتے ہیں وہ ہے کیا؟

جواب: تفکر رفتن از باطل سوئے حق   بہ جزو اندر بہ دیدن کل مطلق

ترجمہ: تفکر یعنی سوچ، باطل سے حق کی طرف جانے کو کہتے ہیں،

کل مطلق (یعنی اللہ تعالیٰ) کے جلوے کو کائنات کے ہر جزء میں دیکھنے کو تفکر کہتے ہیں۔

اس کے بعد اس جواب کی تشریح میں بہت سے اشعار میں کی گئی ہے۔

دوسرا سوال:

کدامین فکر ما را شرط راہ است   چرا گاہ طاعت و گاہی گناہ است

ترجمہ: وہ کونسی سوچ ہے جو معرفت کی راہ پر چلنے کے لیے ضروری اور بنیادی شرط ہے؟

ایسا کیوں ہے کہ کبھی سوچنا اطاعت و عبادت ہوتا ہے اور کبھی گناہ ہوتا ہے۔

جواب: در آلاء فکر کردن شرط راہ است   ولی در ذات حق محض گناہ است

ترجمہ: اللہ کی نعمتوں کے بارے میں غور وفکر کرنا معرفت کی راہ پر چلنے کی بنیادی اور ضروری شرط ہے

لیکن اللہ کی ذات کے بارے میں غور وفکر کرنا گناہ محض ہے۔

قارئین محترم توجہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سورت رحمٰن میں انتیس بار فبای آلاء ربکما تکذبان کہہ کر جن وانس کو اللہ کی نعمتوں کے بارے میں غور وفکر نہ کرنے پر سرزنش کی ہے۔

نیز حدیث میں ہے تفکروا فی خلق اللہ ولا تفکروفی اللہ یعنی اللہ کی مخلوق کے بارے میں غور وفکر کرو مگر اللہ کی ذات کے بارے میں غور وفکر نہ کرو۔ (بحار الانوار 54:348)

محمود شبستری کا یہ شعر اس قرآنی آیت اور اس حدیث کے ساتھ کس قدر ہم آہنگ ہے۔

اب آتے ہیں اس شعر کی طرف:

مسلمان گر بدانستی کہ بت چیست　　بدانستی کہ دین در بت پرستی است

اس شعر سے محمود شبستری اور تصوف کے خلاف استدلال کرنے والوں پر وہ حکایت صادق آتی ہے کہ ایک شخص نے نماز ترک کردی۔اس سے پوچھا گیا کہ تم اچھے بھلے نمازی تھے،نماز کیوں ترک کردی؟ تو اس نے جواب دیا کہ قرآن میں واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ:

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ (نماز کے قریب مت جاؤ)

اسے کہا گیا کہ پوری آیت پڑھو تو پوری بات سمجھ آجائے گی۔پوری آیت اس طرح ہے:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکَارٰی

ترجمہ:اے ایمان والو جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب مت جاؤ۔(نساء:42)

محمود شبستری کے اس شعر کو عرفاء اور عرفان کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے والے کم علم یا بے علم حضرات نے محمود شبستری کی پوری بات ہی نہیں سنی۔اس شعر میں شیخ محمود شبستری نے مسلمانوں کے بارے میں بات کی ہے تو بلا فاصلہ اگلے شعر میں مشرکین کے بارے میں بھی ایک بات کہی ہے:

وگر مشرک زبت آگاہ گشتی　　کجا از دین حق گمراہ گشتی

ترجمہ: اور اگر مشرک بت کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا تو وہ دین حق سے کیوں گمراہ ہوتا؟

مطلب یہ کہ اگر مشرک کو اس حقیقت کا علم ہو جاتا کہ بت کی اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے،وہ اپنے وجود اور اپنی بقاء میں اللہ کا محتاج ہے،تو وہ دین حق سے،یعنی اسلام سے گمراہ ہی نہ ہوتا۔اس کے بعد آگے چل کر مسلمان اور مشرک دونوں کے بارے میں کہتے ہیں:

ندید او از بت الا خلق ظاہر　　بدین علت شد اندر شرع کافر

ترجمہ: اس نے بت کی صرف ظاہری خلقت دیکھی اس لیے شریعت کی رو سے کافر قرار پایا۔

تو ہم گر زو نبینی حق پنہان　　بشرع اندر نخوانندت مسلمان

ترجمہ: اگر تم بھی بت میں پوشیدہ حق کو نہ دیکھو تو تمہیں بھی شریعت میں مسلمان نہیں کہا جائے گا۔

دوسرے الفاظ میں محمود شبستری مسلمان اور مشرک دونوں کی ظاہر بینی کی مذمت کررہے ہیں کہ دونوں بت کے ظاہر کو دیکھتے ہیں مگر بت میں پوشیدہ اللہ تعالیٰ کے جلوے کو نہیں دیکھتے، اس میں اللہ تعالیٰ کی خالقیت، اس کے علم، حکمت، قدرت، ارادے اور دیگر صفات کمال کی تجلی کو نہیں دیکھتے۔

علامہ اقبال اور تصوف:

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے یہ تاثر دینے کی بھی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال تصوف کے خلاف تھے۔ یہ بات درست ہے کہ شروع میں علامہ اقبال عرفان وتصوف کے خلاف تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے اس رائے سے عدول کرلیا تھا اور تصوف وعرفان کے شدید حامی ہو گئے تھے۔ علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے پرویز کی کتاب ''تصوف کی حقیقت'' سے نقل مارتے ہوئے، علامہ اقبال کے اس دور کے اشعار تو نقل کر دیئے جب وہ عرفان وتصوف کے خلاف تھے، لیکن جس قدر تفصیل سے پرویز نے اس پر بحث کی ہے کہ علامہ اقبال بعد میں تصوف کی طرف چلے گئے تھے، علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے اپنی کتاب میں اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔

علامہ اقبال عرفان وتصوف میں رومی کو اپنا مرشد وپیشوا مانتے تھے۔ دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر لندن میں انڈیا سوسائٹی کی طرف سے 4-11-1931 کو ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں تقریر کرتے ہوئے علامہ اقبال نے اپنی فارسی کتب کا تعارف کروایا۔ آخر میں انہوں نے اپنی کتاب جاوید نامہ کا تعارف اس طرح کروایا:

''میری تازہ تصنیف جاوید نامہ مطبع میں جا چکی ہے اور غالبا ایک دو ماہ میں چھپ جائے گی۔ یہ حقیقت میں ایشیاء کی ڈیوائن کامیڈی ہے جیسے دانتے کی تصنیف یورپ کی ڈیوائن کامیڈی ہے۔ اس کا اسلوب یہ ہے کہ شاعر مختلف ستاروں کی سیر کرتا ہے۔ مختلف مشاہیر کی روحوں سے مل کر باتیں کرتا ہے، پھر جنت میں جاتا ہے اور آخر میں خدا کے سامنے پہنچ جاتا ہے۔ دانتے نے اپنا رفیق سفر یا خضر طریق ورِجل کو بنایا تھا اور میرے رفیق سفر یا خضر طریق مولائے روم ہیں''۔

اسی کتاب جاوید نامہ کے آخر میں اپنے بیٹے جاوید کو اور درحقیقت نئی نسل کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

پیر رومی را رفیق راہ ساز　　　　تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

ترجمہ: اگر تم معرفت کی راہ پر چلنا چاہو تو پیر رومی کو اپنا رفیق راہ یعنی رہنما بناؤ،
تا کہ خدا تجھے سوز گداز عطا کر دے۔

زانکہ رومی مغز را داند ز پوست　　　　پائے او محکم فتد در کوئے دوست

ترجمہ: اس لیے کہ رومی چھلکے اور گودے کے فرق کو اچھی طرح پہچانتے ہیں
اور محبوب کے کوچے، یعنی قرب خدا کی راہ میں ان کا قدم بہت مضبوط پڑتا ہے۔

علامہ اقبال رومی سے کس قدر متاثر ہیں اس کا اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے جس نے رومی اور اقبال دونوں کو پڑھا ہو۔ اگر آپ نے رومی کو پڑھا ہو اور پھر آپ اقبال کی جاوید نامہ یا اسرار و رموز کو پڑھ رہے ہوں تو بعض اوقات یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آپ رومی کو پڑھ رہے ہیں یا کسی اور کو۔
رومی کے بارے میں علامہ اقبال کے چند اور اشعار ملاحظہ فرمالیں:

رومی آن عشق و محبت را دلیل　　　　تشنہ کامان را کلامش سلسبیل　　(جاوید نامہ: فلک قمر)

ترجمہ: رومی جو عشق و محبت کے رہنما ہیں ان کا کلام معرفت کے پیاسوں کے لیے سلسبیل کا چشمہ ہے۔

پیر رومی آن امام راستان　　　　آشنائے ہر مقام راستان　　(جاوید نامہ: فلک زحل)

ترجمہ: پیر رومی جو سچ کی راہ پر چلنے والوں کے امام ہیں،
سچ کی راہ پر چلنے والوں کے ہر مقام اور منزل سے آشنا ہیں۔

علامہ اقبال کی روحانی ترقی میں رومی کا کیا کردار ہے اس کا اندازہ ان کے اس شعر سے ہو سکتا ہے:

پیر رومی خاک را اکسیر کرد　　　　از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

ترجمہ: پیر رومی نے میری خاک کو اکسیر بنا دیا، میں تو ایک مشت غبار تھا
جس سے انہوں نے جلوے تعمیر کیے۔ (اسرار خودی: تمہید)

برصغیر کے مسلمانوں کی بیماری کا علاج علامہ اقبال نے یہ تجویز کیا تھا:

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا   تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں (بال جبریل)

منصور حلاج:

دشمنان تصوف وعرفان کی تلوار جس شخصیت پر سب سے زیادہ چلتی ہے وہ ہیں حسین بن منصور حلاج جو تیسری صدی کے عارف تھے۔ ان پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے خدائی کا دعوی کیا تھا۔ اس کے ثبوت میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے انا الحق کا نعرہ لگایا تھا اور اسی وجہ سے انہیں سزائے موت دے دی گئی تھی۔ لیکن ذرا سی بصیرت اور شعور سے کام لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ساری کہانی لغو ہے۔ جو لوگ نعرہ انا الحق کی وجہ سے حلاج کو کافر کہتے ہیں ہم انہیں چیلنج کرتے ہیں کہ وہ اپنے بارے میں انا الباطل کا دعویٰ کر کے دکھائیں۔ اس لیے کہ حق اور باطل ایک دوسرے کی ضد ہیں، جیسے عالم اور جاہل، دن اور رات، روشنی اور تاریکی، اسلام اور کفر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر کوئی چیز یا کوئی شخص حق نہیں ہے تو لامحالہ وہ باطل ہے۔ پس اگر انا الحق (میں حق ہوں) کہنا کفر ہو تو انا الباطل (میں باطل ہوں) کہنا اسلام ہوگا۔ انا الحق کی وجہ سے حلاج پر کفر کے فتوے لگانے والے مفتی صاحبان کو ہمارا چیلنج ہے کہ وہ اپنے بارے میں انا الباطل کا نعرہ لگا کر دکھائیں۔

حلاج کو سزائے موت عباسی خلیفہ المقتدر (علیہ لعنۃ اللہ) کے حکم سے دی گئی۔ مومنین یہ بات نہ بھولیں کہ عباسی خلفاء وہ ملعون حکام جور تھے جنہوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے لے کر امام حسن عسکری علیہ السلام تک ہر امام پر ظلم وتشدد کیا، انہیں قید و بند کی صعوبتوں میں رکھا اور آخر کار ہر امام کو زہر سے شہید کیا۔ انہی ملعونوں کے ظلم وشر سے امام زمانہ علیہ السلام کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت حجت کو پردہ غیب میں محفوظ کر لیا۔ ایسے ملعون ظالم اگر کسی کو قید میں ڈالیں یا سزائے موت دیں تو ایک عقلمند انسان کے ذہن میں سب سے پہلے یہی خیال آئے گا کہ وہ شخص یقیناً کوئی حق پرست ہوگا۔

یہ ملعون عباسی حکمران بنیادی طور پر تاریخ کے بدترین ظالم تھے، حق اور اہل حق کے بدترین دشمن تھے اور حقیقی معنوں میں سگ دنیا تھے۔ سوچنے کی بات ہے کہ ان ملعونوں کا آئمہ معصومین علیہم السلام پر ظلم وجور اور انہیں شہید کرنا اسلام اور توحید کے لیے تھا؟ آئمہ معصومین (علیہم السلام) پر ظلم وجور روا رکھنے

والے، حق اور اہل حق کے دشمن یہ ملعون عباسی خلفاء اسلام اور توحید کے اتنے خیر خواہ تھے کہ اسلام اور توحید کی ہمدردی میں حلاج کو سزائے موت دے دی؟ یاللعجب!!

ملعون عباسی خلیفہ المقتدر 12 یا 13 سال کی عمر میں خلیفہ بنا۔ وہ ایک ظالم اور عیاش شخص تھا۔ اس کے حرم سرا میں عیاشی کے لیے سینکڑوں عورتیں تھیں۔ اس قماش کے شخص دل میں اسلام کا اتنا درد تھا کہ منصور حلاج کے خلافِ اسلام عقائد و نظریات کی وجہ سے اسے سزائے موت دی۔

مزید برآن جس انداز میں حلاج کو سزائے موت دی گئی وہ خود سراسر غیر اسلامی تھا جو اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں سزائے موت دینے والوں کی نظر میں اسلام اور اسلام کے احکام کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اسلام میں لاش کا مثلہ کرنے (اعضاء کاٹنے) کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ انسان تو انسان ہے، اسلام تو پاگل کتے کا مثلہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام نے اپنی وصیت میں فرمایا تھا کہ میرے قاتل کا مثلہ نہ کرنا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ خبردار پاگل کتے کا بھی مثلہ نہ کرنا۔ (نہج البلاغہ مکتوب: 47)

لیکن حلاج کی لاش کا نہیں بلکہ قتل سے پہلے ان کا مثلہ کیا گیا۔ سزائے موت سے پہلے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے، ان کی آنکھیں نکالی گئیں، ان کی زبان کاٹی گئی، ناک اور کان کاٹے گئے، شہادت کے بعد ان کی لاش کو آگ لگائی گئی اور خاکستر دریائے دجلہ میں بہا دی گئی۔ کیا سزائے موت دینے کا یہ انداز اسلامی احکام کے مطابق ہے؟ اس انداز سے سزائے موت دینا خود چیخ چیخ کر اعلان کر رہا ہے کہ جن حکمرانوں نے حلاج کو سزائے موت دی تھی ان بدنہاد ملعونوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سزائے موت کا یہ انداز بتا رہا ہے کہ اس کا محرک حکمرانوں کی ذاتی دشمنی و عناد کے سوا کچھ نہیں تھا۔

لہٰذا یہ کہنا کہ حضرت حجت علیہ السلام کے نائب نے حلاج کے قتل کے حکم نامہ پر دستخط کیے تھے حضرت حجت علیہ السلام پر بہت بڑی تہمت ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ یہ بات کہنے والے معرفت آئمہ معصومین اور معرفت امام زمانہ سے بھی بے بہرہ ہیں۔ وہ اپنے شیعوں کو ان ظالم حکمرانوں کی عدالتوں میں جانے سے منع کرتے تھے اور خود ان کے ایسے سفاکانہ اقدام کی توثیق کریں گے؟

منصور حلاج دراصل مقتدر کے ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔ وہ مقتدر کو باطل اور اس

کے مقابلے میں اپنے آپ کو حق سمجھتے تھے، اور ان کے انا الحق کا مطلب یہی تھا۔ جس کا مقتدر کے فاسق وفاجر، بے ایمان و بدکردار، سگ دنیا درباری فقہاء نے یہ مطلب نکالا کہ انا الحق کے معنی ہیں کہ ''میں خدا ہوں''۔ درحقیقت حلاج کا مقتدر کے مقابل انا الحق کہنا ایسا ہی تھا جیسے فرعون باطل تھا اور اس کے مقابلے پر موسیٰ حق تھے، رسول اللہ، مولا علی، امام حسین، اور دیگر آئمہ علیہم السلام حق تھے اور ان کے مخالفین باطل تھے۔ اب اگر کہا جائے کہ علی حق اور دشمن علی باطل، تو کیا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مولا علی کو اللہ کہا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں فرمایا:

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقا

''کہہ دو کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا اور باطل تو تھا ہی مٹنے والا''۔ (اسراء: 81)

کیا اس کا یہ ترجمہ کیا جائے گا کہ: اللہ آ گیا اور باطل بھاگ گیا؟

انا الحق کے معنی کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سورت مومنون میں انسانوں کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہا ہے: اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنَا كُمْ عَبَثاً

ترجمہ: کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں عبث (یعنی بے مقصد) پیدا کیا ہے؟ (مومنون 115)

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَق

ترجمہ: ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے برحق پیدا کیا۔ (حجر: 85)

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا بَاطِلاً

ترجمہ: ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے،
باطل (یعنی عبث اور بے مقصد) پیدا نہیں کیا؟ (ص: 27)

جو شخص بھی اپنی خلقت میں، اپنی ذات میں اور کائنات میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور وفکر کرے اور اس غور وفکر کے نتیجہ میں اپنی حقیقت کو پالے وہ سورۂ مومنون کی مذکورہ بالا آیت کے جواب میں یہی کہے گا کہ میں بے مقصد اور عبث پیدا نہیں کیا گیا ہوں، میں باطل نہیں پیدا کیا گیا ہوں بلکہ حق ہوں۔ کیا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایسا کہنے والا خدائی کا دعویٰ کر رہا ہے؟ مالکم، کیف تحکمون؟

جب منصور حلاج کو سزائے موت دینے کے لیے اس چبوترے پر لایا گیا جہاں تختہ دار لگایا گیا تھا، تو وہاں موجود افراد میں اس دور کے مشہور عارف شبلی بھی موجود تھے۔ ان کا مصلیٰ ان کے پاس تھا۔ منصور نے ان سے کہا کہ مصلیٰ قبلہ رخ بچھائیں۔ شبلی نے مصلیٰ بچھایا اور منصور نے دو رکعت نماز پڑھی، مناجات کی اور پھر بغیر کسی خوف و ہراس کے، اطمینان وسکون سے تختہ دار کی طرف چل دیئے۔

اگر وہ اپنے آپ کو خدا کہتے تھے تو نماز کس کی پڑھی؟ نماز میں کس کے بارے میں الحمد للہ رب العالمین کہا؟ کس کو خطاب کر کے ایاک نعبد وایاک نستعین کہا، رکوع و سجود میں کس کو سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلیٰ کہا؟

لہٰذا یہ بات بالکل جھوٹ اور بہتان ہے کہ منصور نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ مختصر یہ کہ ہر صاحب معرفت وبصیرت جو اپنی حقیقت کو جان چکا ہو اپنے بارے میں انا الحق ہی کہے گا۔ جن مفتی صاحبان کی نظر میں انا الحق کہنا کفر ہے وہ اپنے بارے میں انا الباطل کا نعرہ لگا کر اپنے اسلام کا اعلان کریں اور ہم سے منہ مانگا انعام پائیں۔

چھٹے باب کا جائزہ

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے چھٹے باب میں کچھ عناوین کے تحت کافی کچی، کمزور اور خلاف واقع باتیں کی ہیں۔

صوفیاء و عرفاء پر جھوٹا الزام:

اقامۃ البرہان کے صفحہ 67 پر علامہ نجفی صاحب دام ظلہ تحریر فرماتے ہیں:

''اس مسلک میں عارف وسالک سے تمام ظاہری عبادات ساقط ہیں''۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اتنی بڑی تہمت اور دلیل وثبوت کے تکلف کی ضرورت تک محسوس نہیں کی گئی۔ گزشتہ صفحات میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ صوفیاء کے مشاہیر و بزرگان نے شریعت کی پابندی کی کتنی سختی سے تاکید کی ہے۔ ہم علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کو چیلنج کرتے ہیں تصوف و عرفان کی کسی معتبر کتاب

سے یہ بات دکھا دیں کہ عارف وسالک سے تمام ظاہری عبادات ساقط ہیں۔علامہ صاحب دام ظلہ نے یہ الزام بھی جڑ دیا ہے کہ صوفیاء وعرفاء اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاتِیَکَ الْیَقِیْنُ

ترجمہ: اپنے رب کی عبادت کرتے رہو یہاں تک کہ تم منزل یقین پر پہنچ جاؤ (حجر:99)

شیعہ عرفاء میں تو صاحب رسالہ مراجع تقلید بھی گزرے ہیں جن کی نظر میں فقہی احکام کی پابندی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کسی بھی فقیہ اور مرجع تقلید کی نظر میں ہو سکتی ہے۔امام خمینی رضوان اللہ علیہ عارف تھے، ان کی توضیح المسائل اور تحریر الوسیلہ اٹھا کر دیکھ لیں۔علامہ سید محمد حسین طباطبائی رضوان اللہ علیہ عارف اور عرفان کی تربیت کرنے والے بے مثال اساتذہ میں سے تھے۔ان کی تالیفات خاص طور پر تفسیر المیزان کا مطالعہ کر کے دیکھ لیں۔ان کی تفسیر میں اسی آیت کی تفسیر ملاحظہ کر لیں۔کیا انہوں وہاں یہ لکھا ہے کہ منزل یقین پر پہنچ جانے کے بعد عارف وسالک سے عبادات ساقط ہو جاتی ہیں۔بلکہ انہوں نے اس آیت کے ذیل میں ایسی باتیں کہنے والے نام نہاد دونمبر کے صوفیاء کی مذمت کی۔آیت اللہ بہجت رضوان اللہ علیہ صاحب رسالہ مرجع تقلید اور عارف تھے، آیت اللہ جوادی آملی دام ظلہ صاحب رسالہ فقیہ، عارف اور مفسر قرآن ہیں۔استاد محترم آیت اللہ العظمیٰ ڈاکٹر محمد صادقی تہرانی رضوان اللہ علیہ صاحب رسالہ مرجع تقلید، عارف اور مفسر قرآن تھے۔ان کی تفسیر موضوعی میں ایک جلد عرفان کے موضوع پر ہے اور اللہ کے موضوع پر دو جلدیں ہیں۔ان میں بھی عرفانی مباحث موجود ہیں۔آیت اللہ علامہ حسن مصطفوی رضوان اللہ علیہ عارف، فقیہ اور مفسر تھے۔ان کی کتب لقاء اللہ، سیر وسلوک اور ان کی تفسیر "تفسیر روشن" دیکھ لیں۔امام خمینی کی کتاب صلاۃ العارفین اور ان کی کتاب آداب الصلاۃ دیکھ لیں۔اسی طرح آیت اللہ جواد تبریزی ملکی جو ایک عارف اور فقیہ تھے ان کی کتاب اسرار الصلوٰۃ کو بھی دیکھ لیں۔ان سب عرفاء میں سے کس نے کہاں یہ بات کہی ہے کہ عارف وسالک سے تمام ظاہری عبادات ساقط ہیں؟

آیت اللہ حسین مظاہری کا بیان:

آیت اللہ حسین مظاہری صاحب رسالہ مرجع تقلید اور عارف ہیں۔ان کی کتاب سیر وسلوک کا

ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

تقید به ظواهر شرع در سیر و سلوک:

تذکر به این نکته نیز بجا است که از ابتد ای سیر و سلوک تا آخرین مرحله آن ملازمت سالک با احکام شرع مقدس الزامی و واجب است و عدم تبعیت از احکام شرعی حتیٰ باندازه سر سوزنی برای سالک، در هر مرحله و مرتبه ای که باشد، مجاز نیست۔۔۔ بنا برین اگر کسی ادعای سیر و سلوک داشته باشد باید دید نسبت به نماز و سایر واجبات چگونه رفتاری دارد؟ اگر پایبندی به نماز ندارد یا در این عبادات مهم سستی به خرج میدهد معلوم می شود که از مدعیان دروغین عرفان و سیر و سلوک است۔ و اگر امر واجبی همچون نماز را علنا ترک کندو این خذلان خود را به مرتبه ای که در سیر و سلوک دارد نسبت دهد علاوه بر اینکه گناه بزرگی مرتکب شده است، در زمره کفار محسوب می شود۔ من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر۔ (سیر و سلوک جلد 2 صفحہ 36)

اب اس عبارت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

سیر و سلوک میں شریعت کے ظاہری احکام کی پابندی:

اس نکتہ کی یاد آوری بھی بجا ہے کہ سیر وسلوک کے آغاز سے لے کر اس کے آخری مرحلہ تک، شریعت مقدسہ کے احکام کی پابندی سالک پر لازم وواجب ہے اور سالک کے لیے سوئی کی نوک کے برابر بھی احکام شرعی کی خلاف ورزی جائز نہیں ہے چاہے وہ سیر وسلوک کے جس بھی مرتبہ پر ہو۔۔۔ بنا بریں اگر کوئی شخص سیر وسلوک کا مدعی ہو تو دیکھنا چاہیے کہ نماز اور دیگر واجبات کے بارے میں اس کا طرز عمل کیسا ہے۔ اگر وہ نماز کا پابند نہ ہو یا ان اہم واجبات کی انجام دہی میں سستی سے کام لیتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ عرفان اور سیر وسلوک کے جھوٹے دعویداروں میں سے ہے۔ اور اگر وہ نماز جیسے کسی واجب امر کو اعلانیہ ترک کر دے، اور اسے اپنے سیر وسلوک کے مرتبہ کی طرف نسبت دے تو نہ صرف یہ کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے بلکہ کفار کے زمرے میں شمار ہو گا۔ من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر۔ (جس سے جان بوجھ کر

نماز ترک کر دی اس نے کفر کیا۔ بحار الانوار جلد 30 صفحہ 674)

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ عرفاء وصوفیاء میں سے کسی کی تحریر میں سے دکھا دیں کہ انہوں اس آیت (وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ) کی روشنی میں کہا ہے کہ عبادت اس وقت تک واجب ہے جب تک یقین حاصل نہ ہو جائے اور جب یقین حاصل ہو جائے تو عبادت ساقط ہو جاتی ہے۔تصوف اور صوفیاء کی نظر میں اتباع شریعت کے بارے میں ہم رسالہ قشیریہ سے اقتباسات پیش کر چکے ہیں۔ اگر بعض نام نہاد اور دونمبر صوفی ایسی باتیں کرتے ہیں تو خود صوفیاء نے ان کی گرفت کی ہے اور انہیں غلط قرار دیا ہے۔ یہ ایسا ہی جیسا کہ بعض بے عمل شیعہ کہتے ہیں کہ عزاداری کر لی جائے تو دوسری کوئی عبادت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اب ان غیر ذمہ دار افراد کی اس بات کو لے کر اگر کوئی شخص یہ کہے کہ شیعہ مذہب میں عبادات ساقط ہیں تو اس کی بات میں کتنی سچائی ہوگی؟ علامہ نجفی دام ظلہ نے صوفیاء اور عرفاء کے بارے میں یہ جھوٹ منسوب کر کے ایک بہت بڑی تہمت لگائی ہے، لوگوں کو ان کے بارے میں غلط معلومات فراہم کی ہیں اور گمراہ کیا ہے۔ عمر کے جس حصے میں وہ ہیں اس میں یہ کام کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ ہم انہیں مخلصانہ مشورہ دیں گے کہ یا تو وہ اصل صوفیاء وعرفاء کی کسی معتبر کتاب سے اس بات کا ثبوت پیش کریں یا پھر اپنی ان باتوں کو واپس لیں اور دل کی گہرائی سے اس گناہ پر استغفار کریں۔

ہاں تصوف وعرفان میں مجذوب کے بارے میں یہ بحث ضرور موجود ہے کہ آیا مجذوب پر شرعی احکامات کی پابندی لازم ہوتی ہے یا نہیں؟ اس بات کو سمجھنے سے پہلے سالک اور مجذوب کے معنی اور فرق سمجھ لینا ضروری ہے۔سلوک راستے پر چلتے جانے کو کہتے ہیں۔ جو شخص شریعت کی مقرر کردہ راہوں کے مطابق، عقل وشعور کی بقاء کے ساتھ تزکیہ نفس وتطہیر باطن اور قرب خدا کی منزل کی طرف چلتا رہتا ہے اسے سالک کہتے ہیں۔جس طرح عام ظاہری سفر کے دوران انسان کو مختلف مناظر نظر آتے ہیں اسی طرح اس روحانی سفر میں سالک کو مختلف روحانی مناظر نظر آتے ہیں۔ عام سفر کے دوران ہم کسی خوبصورت نظارے کو دیکھ کر اس میں کھو نہیں جاتے بلکہ اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرتے ہیں کہ کسی خوبصورت مقام یا منظر پر کچھ دیر کے لیے اپنی گاڑی روک کر ایک وقفہ لے لیتے ہیں اور اس منظر سے لطف اندوز ہو کر دوبارہ اپنی منزل کی طرف اپنا سفر شروع کر دیتے ہیں۔اسی طرح اس روحانی سفر میں بھی سالک

کوخوبصورت روحانی مناظر یعنی تجلیات ومکاشفات کا سامنا ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے۔لیکن سالک ان میں کھونے کی بجائے اپنی منزل یعنی قرب خدا، لقاءاللہ اور انقطاع الی اللہ کے سفر کو جاری رکھتا ہے۔لیکن بعض اوقات کسی کمزور شخص کے ساتھ ایسا حادثہ ہوجاتا ہے کہ وہ کسی تجلی کی تاب نہ لاکر اپنے عقل وہوش کھوکر اس میں ایسا جذب ہوجاتا ہے کہ پھر باہر نہیں نکل سکتا۔ایسے شخص کو مجذوب کہتے ہیں۔مجذوب عقل وشعور کھو چکا ہوتا ہے۔احکام شرعی کی پابندی کی شرائط میں سے ایک شرط عقل ہے۔دیوانے اور بے ہوش پر شرعی احکام لاگو نہیں ہوتے۔وہ مکلف ہی نہیں ہوتا۔اگر کسی آیت اللہ العظمٰی کا ذہنی توازن خراب ہوجائے تو کیا اس کے بعد اس پر احکام شرعی کی پابندی لازمی رہتی ہے؟ ہرگز نہیں۔اسی طرح مجذوب عقل وشعور کے کھوجانے کے بعد مکلف ہی نہیں رہتا اور خود حکم شریعت کی روشنی میں شرعی احکام کی پابندی اس سے ساقط ہوجاتی ہے۔اگر کوئی شخص مکلف ہی نہیں رہا، تو اس پر احکام شرعی کی اطاعت نہ کرنے پر کوئی مواخذہ کیا جاسکتا ہے نہ کوئی عتاب وسرزنش۔اب اس چیز کو بہانہ بناکر اگر تصوف وعرفان کے مخالفین یہ کہیں کہ عرفان وتصوف میں سالک سے سب ظاہری عبادات ساقط ہیں تو یہ بات سو فیصد غلط ہے، جھوٹ ہے، خیانت اور بد دیانتی ہے۔کاش علامہ نجفی دام ظلہ نے عرفان وتصوف کی رد سپرد قرطاس کرنے سے پہلے تصوف وعرفان کی کوئی ایک آدھ مستند کتاب پڑھ لی ہوتی تو اس سنگین غلطی کے ارتکاب سے محفوظ رہتے۔

مراقبہ:

صفحہ 69 پر علامہ نجفی دام ظلہ نے مراقبہ کا عنوان قائم کیا اور اس کے نیچے صرف ڈیڑھ سطریں لکھی ہیں۔ملاحظہ فرمایئے:

''صوفیہ کی مخصوص اعمال وعبادات میں ایک مراقبہ بھی ہے۔جس کا اسلامی اعمال وعبادات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔یہ صرف ان لوگوں کی ذہنی اختراع ہے''۔

اس پر ہمارا پہلا تبصرہ ہے: انا للہ وانا الیہ راجعون۔انتہا ہے لاعلمی اور ناواقفیت کی۔دوسرا تبصرہ یہ ہے کہ مراقبہ کے بارے میں علامہ نجفی دام ظلہ کا یہ بیان بھی ہمارے اس یقین کو مزید پختہ کرتا ہے کہ انہوں نے تصوف وعرفان کا کوئی سرسری مطالعہ تک نہیں کیا ہے۔صرف سنی سنائی معلومات کی بنیاد پر تصوف وعرفان کے خلاف تعصب اور بغض وعناد کا اظہار کیا ہے۔

اب آتے ہیں مراقبہ کی طرف۔ مراقبہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز پر نظر رکھنا، نگرانی کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیۡکُمۡ رَقِیۡباً (اور اللہ تم پر نظر رکھے ہوئے ہے)۔ (نساء :1)

انگریزی میں اس کے لیے Meditation کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بدھ مت میں اسے بھاونا (Bhavana) اور ہندی میں اسے دھیان کہتے ہیں جو اردو اور پنجابی میں بھی اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ علامہ صاحب دام ظلہ کا یہ کہنا کہ مراقبہ کا اسلامی اعمال و عبادات سے کوئی تعلق نہیں ہے اس بات کی واضح نشاندہی کرتا ہے کہ عرفان و تصوف کی کتب تو درکنار اسلامی احادیث کے منابع و مصادر حتیٰ کہ نہج البلاغہ پر بھی ان کی نظر بہت سطحی اور محدود ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:

رحم اللّٰہ عبدا سمع حکما فوعیٰ، و دعی الی رشاد فدنا،

و اخذ ابحجزۃ ھاد فنجا، راقب ربہ و خاف ذنبہ

ترجمہ: اللہ رحم کرے اس بندے پر جس نے حکم کو سنا اور اسے سمجھ لیا، اسے ہدایت کی طرف دعوت دی گئی تو وہ اس کے قریب ہو گیا، اس نے کسی ہدایت کرنے والے کا دامن تھاما اور نجات پا گیا، اپنے رب کا مراقبہ کیا اور اپنے گناہ سے ڈرتا رہا۔ (نہج البلاغہ خطبہ 74)

امیر المومنین علیہ السلام کے اس ارشاد میں رَاقَبَ رَبَّه کے الفاظ نہایت واضح ہیں جن کے معنی ہیں: اس نے اپنے رب کا مراقبہ کیا۔ یعنی اپنے رب کی طرف توجہ رکھی، اپنا دھیان ہر وقت اپنے رب کی طرف رکھا۔ رَاقَبَ فعل ماضی ہے جس کا مضارع یُرَاقِبُ اور مصدر مراقبہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک طویل ارشاد میں ہے:

و اما علامۃ الخاشع فاربعۃ: مراقبۃ اللّٰہ فی السر و العلانیۃ،

و رکوب الجمیل و التفکر لیوم القیامہ و المناجاۃ للّٰہ

ترجمہ: خاشع کی چار علامتیں ہیں: پوشیدہ اور اعلانیہ اللہ کا مراقبہ کرنا، نیک کاموں کو انجام دینا، قیامت کے بارے میں غور و فکر کرنا اور اللہ سے مناجات کرنا۔ (تحف العقول جلد 1 صفحہ 20)

یہاں خاشع کی چار علامات میں سے پہلی علامت ہی مراقبہ ہے جس کے لیے لفظ ہی مراقبہ استعمال ہوا ہے: مراقبۃ اللہ۔ ان دو مثالوں سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ مراقبہ صوفیہ کی اپنی ذہنی اختراع نہیں ہے بلکہ اللہ کے ان بندوں کی نشانی ہے جن کے لیے امیرالمومنین علیہ السلام رحمت کی دعا فرما رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے اللہ کے خاشع بندوں کی چار میں سے پہلی نشانی قرار دے رہے ہیں۔ ہماری کتب حدیث میں مراقبہ کے بارے میں معصومین کے اور بھی ارشادات موجود ہیں۔ مثلاً حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کا یہ ارشاد قابل توجہ ہے:

القصد الی اللہ تعالیٰ بالقلوب ابلغ من اتعاب الجوارح بالاعمال

دل کے ذریعے اللہ کو پانے کا قصد کرنا جسم کو اعمال میں تھکانے

سے زیادہ مفید و مؤثر ہے۔ (بحارالانوار 364:75)

تصوف و عرفان میں استاد اور مربی اپنے شاگردوں کی روحانی اور ذہنی حالت کے مطابق مختلف قسم کے مراقبے تجویز کرتا ہے۔ جن میں سے ہر مراقبہ مرید یا شاگرد کے تعلق باللہ کو مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ قارئین محترم کے لیے ایک سادہ سا مراقبہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ مراقبہ کر کے آپ خود محسوس کر سکتے ہیں کہ روحانی ترقی کے لیے مراقبہ کس قدر مؤثر ہے اور اسے خلاف اسلام کہنا اسلام سے کس قدر ناواقفیت ہے۔ علامہ نجفی دام ظلہ خود بھی یہ مراقبہ کریں اور پھر اس کے بارے میں اپنی رائے دیں۔

فجر کی نماز کے بعد جائے نماز پر تشہد کی حالت میں یا آلتی پالتی مار کر آرام وسکون سے بیٹھ جائیں۔ اگر نیچے بیٹھنا مشکل ہو تو کرسی یا صوفے پر بھی بیٹھ سکتے ہیں۔ اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اپنی سانس پر توجہ رکھیں۔ سانس کو آتے جاتے محسوس کریں۔ چند سانسوں کے بعد دل ہی دل میں اس بات کو دہرائیں کہ: ''میں اللہ کا بندہ ہوں، میں اللہ کا بندہ ہوں، میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ میرا رب ہے، اللہ میرا رب ہے، اللہ میرا رب ہے، وہ ہر حال میں مجھے دیکھ رہا ہے، وہ ہر حال میں مجھے دیکھ رہا ہے، وہ ہر حال میں مجھے دیکھ رہا ہے''۔ دھیان ادھر ادھر بھٹک جائے تو اسے پھر اسی بات پر لے آئیں۔ پندرہ سے بیس منٹ تک آنکھیں بند رکھ کر اپنی توجہ اسی بات پر مرکوز رکھیں پھر آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ اس کے بعد دن بھر

ہرلمحہ، ہرکام کرتے وقت اپنی توجہ اوردھیان اسی بات پر رکھیں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ میرا رب ہے اور اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ رات کو سونے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے اپنے دن بھر کے اعمال کا جائزہ لیں کہ آپ نے کس حد تک اپنا دن اس مراقبہ کے مطابق گزارا ہے اور کس حد تک اس کی مخالفت کی ہے۔ چند مہینے اور چند سال تو دور کی بات ہے چند ہفتے یہ مراقبہ کرنے کے نتیجہ میں آپ خود محسوس کرنے لگیں گے کہ گناہ آپ کی زندگی سے دور ہو گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے آپ کا تعلق بہتر ہو گیا ہے، عبادت میں ایک خاص کیفیت اور لطف محسوس ہوگا اور آپ اپنی زندگی میں ایک عجیب سی روحانی خوشی اور سرور محسوس کریں گے۔

مراقبہ قرآنی آیات کی روشنی میں:

کچھ قرآنی آیات بھی مراقبہ کی نشاندہی کرتی ہیں۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

(1) اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفا

ترجمہ: اپنا چہرہ یکسوئی کے ساتھ دین کی طرف قائم کرلو۔ (یونس:105)

دین کوئی ظاہری طور پر نظر آنے والی چیز نہیں ہے لہٰذا ظاہری چہرہ بھی اس کی طرف قائم نہیں کیا جا سکتا۔ دین ایک معنوی چیز ہے اور اس کی طرف اپنا چہرہ قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہر وقت، ہر حال میں، ہر قول و فعل کو انجام دیتے وقت توجہ یعنی باطنی چہرہ یکسوئی کے ساتھ دین کی طرف رہے۔ اسی کا نام مراقبہ ہے۔ یہ آیت بھی واضح طور پر دین کے مراقبہ کا حکم دے رہی ہے۔

(2) قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ انہوں اپنی قوم سے کہا:

اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّی

ترجمہ: میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں۔(صافات:99)

اللہ تعالیٰ بیرونی دنیا میں کوئی جسمانی وجود نہیں رکھتا کہ کوئی شخص مکانی فاصلہ طے کر کے اس کی طرف جا سکے۔ وہ تو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔اس کی طرف جانے کا راستہ قلبی توجہ ہی ہے۔اسی توجہ کو دوسرے الفاظ میں مراقبہ کہا جاتا ہے۔

(3) صوفیاء کے ہاں اس آیت سے بھی مراقبہ کے بارے میں استدلال کیا جاتا ہے:

وَ لْتَنْظُرْ نَفْس مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ

ترجمہ: ہر انسان کو چاہیے کہ وہ دیکھتا رہے کہ وہ اپنے کل (یعنی آخرت) کے لیے کیا (اعمال) آگے بھیج رہا ہے۔ (حشر:18)

اس آیت کی رو سے ہر انسان پر فرض ہے کہ وہ ہر وقت، ہر حال میں اس بات پر نظر رکھے کہ اسے کل قیامت کے دن اپنے اعمال کے مطابق اخروی زندگی ملنی ہے۔لہٰذا اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے ایک ایک عمل پر نظر رکھے اور دیکھتا رہے کہ وہ کیا کر رہا ہے اور اپنی آخرت کے لیے کون سے اعمال کا ذخیرہ تیار کر رہا ہے۔اسے ''اعمال کا مراقبہ'' کہا جاتا ہے جو اس آیت کے واضح حکم کی رو سے فرض ہے۔

حقیقت اور جوہر کے اعتبار سے سب اسلامی عبادتیں: نماز، روزہ، حج، عمرہ، اعتکاف وغیرہ مراقبہ ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔مستحب نمازوں میں سے ایک نماز، نماز امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف ہے۔اس میں اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہو کر ہر رکعت میں قلبی توجہ کے ساتھ سو مرتبہ **ایاک نعبد و ایاک نستعین** کہنا، حقیقت میں **ایاک نعبد و ایاک نستعین** کا مراقبہ ہے۔لہٰذا مراقبہ کو غیر اسلامی کہنا مراقبہ اور اسلام دونوں سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

مراقبہ کے حوالے سے ایک حکایت بھی کتب تصوف میں معروف ہے کہ ایک استاد نے کچھ شاگردوں کو اس آیت کا مراقبہ کرنے کو کہا: اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی (کیا انسان اس بات کو نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔علق: 14)۔کچھ دنوں کے بعد شاگردوں نے کہا کہ یہ مراقبہ کر لیا اب اس سے اگلا سبق دیجیے۔استاد نے کہا فی الحال اسی کو جاری رکھو مناسب موقع پر اگلا سبق بھی دے دیں گے۔کچھ دن بعد استاد نے سب شاگردوں کو ایک ایک کبوتر اور چھری دی اور کہا کہ کبوتر کو ایسی جگہ ذبح کر کے لے آؤ جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔کچھ دیر بعد ایک کے سوا سب شاگر کبوتر ذبح کر کے لے آئے۔استاد نے اس ایک سے پوچھا تمہارے دوست کبوتر ذبح کر کے لے آئے تم کیوں کبوتر کو زندہ واپس لے آئے؟ شاگرد نے جواب دیا کہ آپ نے خود ہی تو حکم دیا تھا کہ کبوتر ایسی جگہ ذبح کرنا ہے جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔میں جہاں بھی گیا میں نے یہ دیکھا کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔لہٰذا میں کسی بھی جگہ اسے ذبح نہ کر سکا اور اسے زندہ واپس لے آیا۔

استاد نے اسے شاباش دی اور کہا کہ صرف تم نے یہ مراقبہ صحیح طرح سے کیا ہے۔

مراقبہ کے حوالے سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ باقاعدگی کے ساتھ مراقبہ کرنے سے ایک خاص قسم کا روحانی سکون اور اطمینان حاصل ہوتا جس سے جسمانی اور نفسیاتی صحت پر بھی بہت اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جب ماہرین صحت نے دیکھا کہ مراقبہ کرنے والے لوگ جسمانی اور نفسیاتی لحاظ سے بہت صحت مند ہوتے ہیں تو انہوں نے اس پر تحقیقات شروع کردیں۔ ان کی تحقیقات کا نتیجہ یہ نکلا مراقبہ انسان کی جسمانی اور نفسیاتی صحت پر بہت مثبت اور مفید اثرات رکھتا ہے۔ مزید تحقیق اور تجربات کے بعد Meditaion Therapy کو ایک متبادل طریقہ علاج (Alternative Medicine) کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا اور عالمی ادارہ صحت (WHO) نے بھی اسے باقاعدہ طریقہ علاج کے طور پر منظور کرلیا ہے اور اب امریکہ اور یورپ سمیت دنیا بھر میں یہ طریقہ علاج تیزی سے مقبول ہو رہا ہے اور اس موضوع پر پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے گئے ہیں اور لکھے جارہے ہیں۔ سری لنکا میں واقع آلٹرنیٹو میڈیسن (Alternative Medicine) کی عالمی یونیورسٹی میں اس کی تربیت دی جاتی ہے۔ راقم الحروف نے اس یونیورسٹی کے ہسپتال میں اور پاکستان میں ڈیپریشن کے بہت سے مریضوں کا مراقبہ کے ذریعے کامیاب علاج کیا ہے۔ اس یونیورسٹی میں اسلامی مراقبہ کا تعارف کروانے کا اعزاز بھی اس ناچیز کو حاصل ہے۔

مراقبہ کے حوالے سے یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ گزشتہ چند دہائیوں میں مائنڈ سائنس کے نام سے معروف ہونے والی سائنس کی بنیادیں بھی بدھ مت کے مراقبوں پر رکھی گئی ہیں۔

ذکر جلی و ذکر خفی:

اقامۃ البرہان کے صفحہ 70 پر علامہ نجفی صاحب دام ظلہ ذکر جلی و خفی کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

"ہاں البتہ یہ لوگ کچھ اوراد و ظائف اور کچھ ذکر جلی و خفی ضرور کرتے ہیں۔ مگر کرتے اس طرح ہیں کہ وہ عبادت کے زمرہ میں نہیں آتے بلکہ بدعت کے زمرہ میں آتے ہیں۔ کیونکہ یہ حلقے بنا کر اور گلے پھاڑ پھاڑ کر نہ صرف عام سر تال کے ساتھ بلکہ غنا و سرود و موسیقی کے ساتھ ذکر جلی کرتے ہیں اور پھر ان کو حال

پڑتے ہیں۔حالانکہ یہ ذکر جلی نص قرآنی کے خلاف ہے۔ پھر دو آیات اور ان کا ترجمہ لکھ کر اپنی بات اس طرح آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گدھوں کی طرح بلند آواز سے ذکر خدا کرنا شرعاً غلط ہے''۔

اس بات پر پہلا تبصرہ تو یہ ہے کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بے علمی اور ناواقفیت کی انتہاء ہے۔ علامہ صاحب دام ظلہ کا لہجہ اور انداز صاف بتا رہا ہے کہ ان کے پاس تصوف وعرفان کے بارے میں معلومات بالکل بھی نہیں ہیں لیکن دل میں عرفان وتصوف اور صوفیاء وعرفاء کے خلاف تعصب اور بغض و عناد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

علامہ صاحب دام ظلہ کے مطابق ذکر جلی کی یہ تین خصوصیات ہیں:

1۔ حلقے بنا کر 2۔ گلے پھاڑ پھاڑ کر 3۔ سر، تال اور غنا وسرود وموسیقی

اگر علامہ صاحب دام ظلہ تصوف کی کسی معتبر کتاب میں دکھا دیں کہ صوفیاء ذکر جلی گلے پھاڑ پھاڑ کر اور سر تال اور غنا وسرود وموسیقی کے ساتھ کرتے ہیں تو ہم سے منہ مانگا انعام لے لیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ وہ قوالی اور سماع کو ذکر جلی سمجھ بیٹھے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یقیناً یہ بہت بے علمی اور ناواقفیت کی بات ہے اور اس پر ایک ہی بات کہی جاسکتی ہے: انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب دیکھتے ہیں کہ خود صوفیاء ذکر جلی وخفی کے بارے میں کیا کہتے ہیں:

رسالہ قشیریہ میں ابوالقاسم قشیری لکھتے ہیں: ''**الذکر رکن قوی فی طریق الحق سبحانه و تعالیٰ بل هو العمده فی هذا الطریق و لا یصل احد الی الله تعالیٰ الا بدوام الذکر۔ والذکر علی نوعین: ذکر القلب و ذکر اللسان، فذکر اللسان یصل به العبد الی استدامة ذکر لقلب و التاثیر لذکر القلب فان کان العبد ذاکرا ابلسانه و قلبه فهوا الکامل فی وصفه فی حال سلوکه** (صفحہ 221)

ترجمہ: حق سبحانہ وتعالیٰ کے راستے میں ذکر ایک قوی رکن ہے بلکہ اس راستے میں یہی اہم ہے اور دوام ذکر کے بغیر کوئی اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور ذکر کی دو قسمیں ہیں: ذکر قلب اور ذکر لسان۔ ذکر لسانی کی بدولت انسان دائمی قلبی ذکر تک پہنچ سکتا ہے اور تاثیر ذکر قلب کی ہوتی ہے۔ جب بندہ دل اور زبان دونوں

سے اللہ کا ذکر کرتا ہو تو وہ سلوک میں کامل ہوتا ہے۔
محمد مسیح اللہ اپنی کتاب: شریعت و تصوف صفحہ 188 پر لکھتے ہیں:

اقسام ذکر: ذکر کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن مقصود ذکر سے مطلوب کا حاصل کرنا ہے۔ اس لیے جس ذکر سے یہ فائدہ و مقصود حاصل ہو جائے وہی ذکر ہے خواہ وہ نماز و روزہ ہو یا ادعیہ ماثورہ یا درود شریف ہوں۔ لیکن یاد رہے کہ مقصود اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کبر سے نہ نکل جائے، ذاکر اپنے آپ کو مٹا نہ دے، طالب خدا اس کے ذکر میں اس قدر منہمک ہو جائے کہ اپنے آپ کو اور ماسوا اللہ کو بھول جائے۔
پھر آگے چل کر صفحہ 193 پر ذکر جلی و خفی کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

ذکر لسانی کو جلی اور ذکر قلبی کو خفی کہتے ہیں۔ اور یہ بھی ہے کہ لسانی کے جہر کو جلی اور غیر جہر کو خفی کہتے ہیں۔ ذکر جلی کی ادنیٰ حد تو معین ہے، وہ زبان کو حرکت دینا یا اپنے آپ کو سنانا ہے لیکن اکثر کی کوئی حد نہیں، یہ اپنے اپنے نشاط پر ہے۔ مگر اس بات کا خیال ضروری ہے کہ کسی نمازی یا سونے والے کو ایذاء نہ ہو''۔

لیجیے بات واضح ہوگئی کہ ذکر جلی کرتے وقت اس بات کا ضرور خیال رکھا جائے کہ آپ کے ذکر جلی سے کسی سونے والے کی نیند یا کسی نمازی کی نماز میں خلل پیدا نہ ہو۔

جب صوفیاء خود یہ کہہ رہے ہیں کہ ذکر جلی اتنی اونچی آواز میں نہ ہو جس سے کسی سونے والے کی نیند خراب ہو یا نمازی کی نماز میں خلل پڑے تو یہ کہنا کہ ذکر جلی گدھوں کی طرح گلے پھاڑ پھاڑ کر، سر تال اور غنا و موسیقی کی ساتھ کیا جاتا ہے، کتنا بڑا جھوٹ اور بہتان ہے۔ اللہ تعالیٰ علامہ نجفی دام ظلہ کو معاف فرمائے۔

ذکر جلی کے بعد موصوف نے صوفیاء کے ذکر خفی پر بھی تنقید فرمائی۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

''باقی رہا ان لوگوں کا ذکر خفی، اگرچہ فی ذاتہ درست ہے مگر یہ لوگ اپنی غلط روش و رفتار کی وجہ سے اسے غلط بنا دیتے ہیں۔ مثلاً اس کے لیے مخصوص حلقے بناتے ہیں اور مخصوص ہیئت کذائیہ کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور مخصوص مقدار میں ذکر کرتے ہیں جبکہ نہ خدا نے اس مخصوص طریقہ کا حکم دیا ہے اور نہ حضرت رسول خدا نے ایسا عمل کیا ہے اور نہ آئمہ اطہار و صحابہ اخیار نے ایسا کیا ہے اور نہ ہی ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا اس ذکر کو بھی چار و ناچار بدعت ہی کہنا پڑے گا۔''

اگر علامہ نجفی صاحب دام ظلہ عرفان وتصوف کا مطالعہ نہیں رکھتے تو فقہ تو پڑھے ہوئے ہیں۔ فقہ میں ایسا کمزور استدلال!!! استغفراللہ

فقہ میں یہ بات ثابت ہے کہ غیر توقیفی عبادات میں مکلف کو پوری آزادی ہے کہ وہ جب چاہے، جیسے چاہے عبادت کرسکتا ہے۔اس اصول کا اطلاق ذکر پر بھی ہوتا ہے۔مثلاً زمین پرتشہد کی حالت میں بیٹھ کر، آلتی پالتی مار کے، کرسی پر بیٹھ کر، صوفے پر بیٹھ کر، کھڑے ہوکر، انفرادی طور پر یا چند افراد مل کر جتنی تعداد میں جو بھی ذکر کرنا چاہیں کر سکتے ہیں، اس کی ممانعت پر کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ہی اسے بدعت کہا جاسکتا ہے۔ بدعت صرف اس صورت میں کہا جائے گا جب کوئی شخص یہ کہے کہ اس خاص انداز میں اس خاص ذکر کا اللہ تعالیٰ نے وجوبی یا استحبابی حکم دیا ہے۔ باقی جہاں تک ذکر کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے مومن بندوں کی صفات میں سے ایک صفت یہ بیان کی ہے:

يَذْكُرُوْنَ اللهَ قِيَاماً وَّ قُعُوْداً وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آلعمران:191)

ترجمہ: وہ کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔

اب اس میں کیفیت، ذکر، ذکر کی تعداد کی کوئی قید وشرط نہیں ہے۔دس مومن ایک جگہ دائرے کی شکل میں آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہیں اور درود پاک کی ایک ایک تسبیح پڑھ لیتے ہیں۔شریعت نے ایسا کرنے سے کہاں منع کیا ہے؟ ایک اور جگہ دس مومن مربع شکل میں کرسیوں پر بیٹھ کر اللہ اکبر کی ایک ایک تسبیح پڑھ لیتے ہیں۔شریعت نے ایسا کرنے سے کہاں منع کیا ہے؟ ایک اور جگہ پر کچھ مومنین ایک کلاس روم کی شکل میں کرسیوں پر بیٹھ کر یا مجلس عزا کے مجمع کی صورت میں بیٹھ کر سبحان اللہ کی ایک ایک تسبیح پڑھ لیتے ہیں۔ یا کسی اور شکل میں اللہ تعالیٰ کا کوئی اور ذکر کرتے ہیں۔شریعت نے ایسا کرنے سے کہاں منع کیا ہے؟ آپ کسی بھی اجتماعی اور انفرادی انداز میں، کسی بھی تعداد میں کوئی بھی ذکر کریں اور بیٹھنے کا کوئی بھی انداز اپنا لیں، اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ بدعت صرف اس صورت میں کہا جائے گا جب ان میں سے کسی خاص صورت کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اللہ نے اس کا وجوبی یا استحبابی حکم دیا ہے۔

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے اس پیراگراف کے آخر میں فرمایا ہے کہ: ''لہٰذا اس ذکر کو بھی چارو

ناچار بدعت ہی کہنا پڑے گا۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ دھونس، دھکے اور دھاندلی سے اسے بدعت کہنا پڑے گا۔ ورنہ از روئے شریعت اسے غلط اور بدعت کہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ بدعت کے بارے میں علامہ نجفی دام ظلہ کی اس منطق کو مان لیا جائے تو سب مجالس عزا (جن سے وہ خود بھی خطاب فرماتے ہیں) اور جلوس ہائے عزا داری، حدیث کساء اور دعائے کمیل و دعائے توسل کی محافل اور علامہ صاحب کا مخصوص انداز کا عبا قبا اور عمامہ پہننا بھی بدعت کے زمرے میں آ جائے گا۔ کیا علامہ صاحب دام ظلہ ان سب کے بدعت ہونے کا فتویٰ دینے کو تیار ہیں؟ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ دل سے تو ان سب کو بدعت سمجھتے ہیں لیکن عوام کے خوف اور معاشرتی مجبوریوں کی وجہ سے نہ صرف خاموش رہتے ہیں بلکہ یہ سب کچھ کرتے بھی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی مختلف کیفیات کے لحاظ سے انسان کی روحانی ترقی کے لیے ذکر جلی و ذکر خفی دونوں ضروری ہیں۔ شریعت مطہرہ نے ان دونوں کا ایک حسین اور متوازن امتزاج نماز کی صورت میں ہم پر فرض کر دیا ہے۔ پانچ اوقات کی نماز فرض ہے اور نماز کے بارے میں فرمایا گیا:

اَقِمِ الصَّلاۃَ لِذِکْرِیْ (نماز قائم کرو میرے ذکر کے لیے۔ طہ 14)

اس سے واضح ہو گیا کہ نماز کی اصل اللہ کا ذکر ہے۔ اسی لیے منافقین کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا (جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی اور کاہلی کی حالت میں ہوتے ہیں اور اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں۔ نساء:142)

یہ نماز جو اللہ کے ذکر کے لیے فرض کی گئی ہے اس کی دو قسمیں ہیں: نماز جہری اور نماز اخفاتی۔ فجر، مغرب اور عشاء کی نمازیں جہری ہیں۔ یعنی ذکر جلی کے زمرے میں آتی ہیں جبکہ ظہر و عصر کی نمازیں اخفاتی ہیں جو ذکر خفی کے زمرے میں آتی ہیں۔ علاوہ ازیں ہر نماز اپنی جگہ پر ذکر جلی و ذکر خفی کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اخفاتی نمازوں میں حالت قیام میں قرائت قرآن اور تیسری اور چوتھی رکعت میں حالت قیام کا ذکر، ذکر خفی ہوتا ہے لیکن رکوع و سجود کا ذکر اور رکوع و سجود سے اٹھتے وقت کے اذکار اور تشہد و سلام، سب کا بالجہر یعنی ذکر جلی ہونا مستحب ہے۔ اسی طرح جہری نمازوں میں تیسری اور چوتھی رکعت میں حالت قیام کا ذکر یا تلاوت ذکر خفی کا مصداق ہوتی ہے۔

☆☆☆

جلسات و حلقات ذکر:

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے صوفیاء و عرفاء کے ذکر کے حلقوں پر تنقید فرمائی ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس موضوع پر بھی ان کی معلومات ناقص اور سنی سنائی پر مبنی ہیں۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اس اعتراض کو بھی فرامین معصومین کے ترازو میں تول لیا جائے۔

حلقات ذکر کے بارے میں صوفیاء اس روایت سے استدلال کرتے ہیں:

ان رسول اللہ خرج علیٰ اصحابہ فقال ارتعوا فی ریاض الجنۃ،

قالوا یا رسول اللہ و ما ریاض الجنۃ؟ قال حلقات الذکر

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: جنت کے باغوں میں چرا کرو۔ اصحاب نے عرض کی یا رسول اللہ جنت کے باغوں سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: ذکر کے حلقے۔

ابن فہد حلی ایک جلیل القدر شیعہ عالم تھے جو امام حسین علیہ السلام کے روضہ اطہر کے مجاور بھی تھے اور ان کا اپنا مقبرہ بھی کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے روضہ اقدس سے تھوڑے سے فاصلے پر ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب عدۃ الداعی میں اس روایت کو اس طرح نقل کیا ہے کہ:

ان رسول اللہ خرج علیٰ اصحابہ فقال ارتعوا فی ریاض الجنۃ،

قالوا یا رسول اللہ و ما ریاض الجنۃ؟ قال مجالس الذکر

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: جنت کے باغوں میں چرا کرو۔ اصحاب نے عرض کی یا رسول اللہ جنت کے باغوں سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: ذکر کی مجالس۔ (عدۃ الداعی صفحہ 253)

اسی سلسلے میں ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اذا مررتم فی ریاض الجنۃ فارتعوا قالوا

یا رسول اللہ ما ریاض الجنہ؟قال حلق الذکر، فان للہ سیارات من الملائکۃ یطلبون حلق الذکر فاذا اتوا علیھم حفوا بھم

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب تم جنت کے باغوں کے پاس سے گزرو تو چرلیا کرو۔لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! جنت کے باغات سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: ذکر کے حلقے۔ اللہ تعالیٰ کے ایسے چلتے پھرتے فرشتے ہیں جو ذکر کے حلقوں کی طلب میں ہوتے ہیں۔ جب وہ ان کے پاس آتے ہیں تو ان کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں۔ (بحارالانوار 1:205)

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم بادر وا ریاض الجنۃ

قالوا وما ریاض الجنۃ قال حلق الذکر

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنت کے باغوں کی طرف تیزی سے بڑھو۔اصحاب نے کہا یا رسول اللہ! جنت کے باغات سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: ذکر کے حلقے۔(معانی الاخبار 321)

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مجالس ومحافل ذکر جنت کے باغات ہیں، اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انہیں جلسات ذکر کہا جائے یا حلقات ذکر۔

عدۃ الداعی اور معانی الاخبار کی مذکورہ بالا روایات تیس جلدی وسائل الشیعہ کی ساتویں جلد کے صفحہ 230 اور 231 میں بھی ہیں جس کا علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے ترجمہ بھی کیا ہے۔ہم یہ جاننے سے قاصر ہیں کہ حلقات ذکر پر تنقید کرتے وقت وہ ان روایات کو کیوں بھول گئے۔

چلہ کشی:

اپنی کتاب کے صفحہ 71 پر علامہ نجفی صاحب دام ظلہ تحریر فرماتے ہیں:

یہ لوگ کرامات کے حصول کی خاطر چلہ کشیاں کرتے ہیں اور جانکاہ مشقتیں جھیلتے ہیں۔کوئی دریا میں کھڑا ہے، کوئی کنویں میں لٹکا ہوا ہے، کوئی ایک ٹانگ پر کھڑا ہے، اور کوئی دونوں ہاتھ یا ایک ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑا ہے۔ نہ نماز، نہ روزہ، نہ قانون شریعت کی پابندی۔ جیسا کہ ان لوگوں کے حالات میں ملتا ہے۔ علامہ نجفی صاحب کو چیلنج ہے کہ عرفان وتصوف کی کسی کتاب میں ایسی چلہ کشی کا ذکر دکھا دیں۔

عرفان وتصوف میں اس قسم کی کوئی چلہ کشی نہیں ہوتی ۔ہاں عامل حضرات کے ہاں اس قسم کی چلہ کشی کی کوئی مثال ملتی ہوتو وہ الگ بات ہے۔تصوف کی عبادات وریاضت اور عاملوں کے عملیات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔اگر کوئی ان دونوں کو ایک سمجھتا ہےتو وہ سراسر جاہل ہے ۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جاہل اور بے عمل ملنگوں کو دیکھ کر کوئی شخص شیعہ اور تشیع کو ہدف تنقید بنانا شروع کردے۔

تصوف اور عرفان میں چلہ کشی ہوتی ہےلیکن وہ اس قسم کی نہیں ہوتی جس کی مثالیں علامہ نجفی دام ظلہ نے دی ہیں۔عرفان وتصوف کی چلہ کشی اس حدیث کی روشنی میں ہوتی ہیں:

من اخلص لله اربعین صباحا فجر الله ینابیع الحکمة من قلبه علی لسانه

ترجمہ:جس نے اپنے آپ کو چالیس دن تک اللہ کے لیے خالص کیے رکھا اللہ تعالیٰ حکمت کے چشمے اس کے دل سے اس کی زبان پر جاری کر دیتا ہے۔ (عدۃ الداعی:232)

اس مضمون کی احادیث کی تعداد کافی زیادہ ہے۔قرآن مجید میں چلہ کا ذکر اس آیت میں ہے:

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰىٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً

ترجمہ:اور جب ہم نے موسیٰ کو چالیس راتوں کے وعدے پر بلایا ۔ (بقرہ:51)

اس حدیث اور اس آیت کی روشنی میں چالیس دن تک اپنے آپ کو خالص اللہ تعالیٰ کی بندگی و عبادت اور ذکر وفکر ومناجات کے لیے محدود کردینا کون سا غلط کام ہے؟ ممکن ہے کسی خاص صورت میں بعض جزئیات سے اختلاف رائے کی کوئی گنجائش موجود ہو،لیکن اس حدیث اور اس آیت کے ہوتے ہوئے چلہ کشی کی مذمت یا مخالفت کرنا بہت ہی عجیب اور غیر عالمانہ فعل محسوس ہوتا ہے۔

خانقاھوں کی تعمیر:

صفحہ 71 پر خانقاہوں کی تعمیر پر اعتراض کرتے ہوئے علامہ نجفی دام ظلہ نے صرف طعن وتشنیع سے کام لیا ہے۔کوئی علمی بات نہ کوئی علمی اعتراض ۔ خانقاہیں صوفیاء کی رہائشی تربیت گاہیں ہوتی ہیں ۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ہوسٹل ہوتے ہیں، مسلح افواج اور پولیس کے ٹریننگ سنٹرز بھی اقامتی تربیت گاہیں ہوتی ہے۔سب باتوں کو چھوڑیئے ،مولوی صاحبان کے مدارس کو لے لیجیے، یہ بھی اقامتی درس گاہیں

ہیں۔ اگر صوفیاء کی ایسی تربیت گاہیں ہوں تو اس میں اعتراض کی کیا بات؟ کیا اس اعترض کی کوئی گنجائش ہے کہ جب مساجد موجود ہیں تو مدارس کی کیا ضرورت ہے؟ کیا اس اعتراض کی گنجائش ہے کہ جب مساجد موجود ہیں تو امام بارگاہوں کی کیا ضرورت ہے؟ مساجد کی اپنی حدود ہوتی ہیں، ان کے مخصوص احکام ہوتے ہیں جو دوسری جگہوں کے نہیں ہوتے۔ بے راہ روی و بدکاری کے جو الزامات علامہ نجفی صاحب نے خانقاہوں پر لگائے ہیں ان کا جواب تو قیامت کے دن اللہ کی عدالت میں انہیں دینا ہی ہوگا۔ ہم کوئی الزام نہیں لگانا چاہتے لیکن مدارس میں ایسے واقعات ہونے کی خبریں اخبارات میں گاہ گاہ چھپتی رہتی ہیں۔ اگر ایسے ہی واقعات کالج یا یونیورسٹی کے ہوسٹل میں ہوں تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہوسٹل کا ہونا غلط ہے؟ کالی بھیڑیں ہر جگہ ہوتی ہیں۔ مدارس و مساجد میں سے جو فرقہ وارانہ نفرتیں اور دشمنیاں پھیلائی جا رہی ہیں اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ انسانی قتل جنسی بے راہ روی اور بدکاری سے بڑا جرم اور گناہ ہے؟ اور کیا یہ بھی حقیقت نہیں ہے کہ فتنہ و فساد قتل سے بھی بڑا جرم اور گناہ ہے؟ اور کیا یہ بھی ایک حقیقت نہیں ہے کہ یہ گناہ جو قتل اور جنسی بے راہ روی سے بھی زیادہ بڑا ہے مساجد و مدارس سے جنم لے رہا ہے؟ علامہ اقبال نے جس وقت کہا تھا: ''دین ملا فی سبیل اللہ فساد'' اس وقت حالات کتنے بہتر تھے۔ اگر علامہ آج کے ملا کو دیکھ لیتے تو کیا کہتے؟ یقیناً سب مدارس و مساجد ایسے نہیں ہیں لیکن اس فتنہ کے مراکز مساجد و مدارس ہی ہیں۔ اب اگر کچھ مساجد و مدارس میں وہ گناہ پل رہا ہے جو قتل اور جنسی بے راہ روی سے درجہا بڑا گناہ ہے تو کیا یہ اس بات کا جواز بن سکتا ہے کہ سب مساجد و مدارس کو برا سمجھا جائے۔ **مالکم کیف تحکمون**

شریعت، طریقت اور حقیقت:

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے صفحہ 73 پر شریعت، طریقت اور حقیقت کا عنوان قائم کر کے اس کے ذیل میں عامیانہ معلومات پر مبنی چند سطریں لکھی ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ عرفان اور تصوف کی ان اصطلاحات کے معنی سے نابلد ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اگر ان لوگوں کی کتابوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ان لوگوں کی نگاہ کج بین میں شریعت ایک چراغ کی مانند ہے جسے سالک شب تاریک میں لے کر چلتا ہے اور

طریقت وہ راستہ ہے جس پر سالک چلتا ہے اور اصل منزل مقصود تک پہنچ جانا حقیقت ہے۔

پس جب سالک واصل باللہ اور فنافی اللہ ہو جائے تو پھر نہ شریعت کی کوئی حقیقت باقی رہتی ہے نہ طریقت کی۔ اسی بنا پر رومی نے مثنوی کی جلد پنجم کی مقدمہ میں صاف صاف لکھا ہے: اذا ظہرت الحقائق بطلت الشرائع جب حقائق ظاہر ہو جائیں تو پھر شریعتیں باطل ہو جاتی ہیں۔

اناللہ و انا الیہ راجعون۔ فلیبک علی الاسلام من کان باکیا

کیا یہی اسلام ہے؟ اور کیا یہی تعلیم اسلام ہے؟ کیا اسلام وقرآن انہی خرافات کی تعلیم وتلقین کے لیے آیا تھا؟ (العیاذ باللہ) اور نزول قرآن کی یہی غرض وغایت تھی؟ مالکم کیف تحکمون

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں   ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

قارئین محترم یہ تھا اس عنوان پر علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کا بیان جو ہم نے من وعن نقل کر دیا۔ علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے اپنی بات کا آغاز اس جملے سے کیا ہے: ''اگر ان لوگوں کی کتابوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے ۔۔۔۔۔۔۔''

ان کی اس بات کے جواب میں ہم کہیں گے کہ کاش علامہ صاحب نے عرفان وتصوف کی کسی اچھی سی کتاب کا بنظر غائر نہیں بلکہ سطحی اور سرسری مطالعہ کر لیا ہوتا تو ایسی کچی اور بے بنیاد باتیں نہ کرتے۔

چونکہ علامہ صاحب دام ظلہ نے اس بیان میں مثنوی معنوی کی پانچویں جلد سے ایک سطر اور وہ بھی غلط نقل کر کے ایک غلط نتیجہ اخذ کیا ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رومی کی پوری عبارت اور اس کا ترجمہ قارئین کے سامنے پیش کیا جائے اور پھر فیصلہ بھی قارئین پر چھوڑ دیا جائے۔
مثنوی معنوی کے دفتر پنجم کی تمہید جو رومی نے تحریر کی ہے ملاحظہ فرمائیے:

این مجلد پنجم است از دفترهای مثنوی و تبیان معنوی در بیان آنکه شریعت همچو شمع است ره می نماید و بی آنکه شمع بدست آوری راه رفته نشود۔ و چون در ره آمدی آن رفتن تو طریقت است و چون رسیدی بمقصود ان حقیقت است۔ و جهت اینکه گفته اند لو ظهرت الحقائق بطلت الشرائع هم چنانکه مس زر شود ویا خود از اصل زر بود اورا نه علم

کیمیا حاجت است که آن شریعت است و نه خود را در کیمیامالیدن که آن طریقت است۔ چناکہ گفته اند طلب الدلیل بعدالوصول الی المدلول قبیح و ترک الدلیل قبل الوصول الی المدلول مذموم۔ حاصل آنکه شریعت همچون علم کیمیا آموختن است از استاد یا از کتاب و طریقت استعمال کردن داروها و مس را در کیمیا مالیدن است و حقیقت زر شدن مس۔ کیمیا دانان بعلم کیمیا شاد شدند که ما علم این میدانیم و عمل کنندگان بعمل کیمیا شاد اند که ما چنین کارها کنیم و حقیقت یا فتگان بحقیقت شادند که ما زر شدیم و از علم و عمل کیمیاء آزاد شدیم، عتقاء الله ایم۔ کل حزب بما لدیهم فرحون۔ یا مثال شریعت همچو علم طب آموختن است و طریقت پرهیز کردن بموجب طب و دارو ها خوردن و حقیقت صحت یافتن ابدی و از آن هر دو فارغ شدن۔ چون آدمی از این حیات میرد شریعت و طریقت از او منقطع شود و حقیقت ماند، حقیقت اگر دارد نعره میزند که یا لیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی و اگر ندارد نعره میزند که یالیتنی لم اوتی کتابیه و لم ادر ما حسابیه یا لیتها کانت القاضیه ما اغنی عنی مالیه هلک عنی سلطانیه۔ شریعت علم است، طریقت عمل است ، حقیقت وصول الی الله۔ فمن کا یرجو القاء ربه فلیعمل عملا صالحا و لا یشرک بعبادة ربه احدا

ترجمہ: یہ مثنوی کے دفاتر میں سے پانچویں جلد ہے اور اس معنی کا بیان ہے کہ شریعت شمع کی مانند ہے جو راہ دکھاتی ہے۔ شمع کے بغیر راستہ طے نہیں کیا جاسکتا۔ جب تم راستے پر آجاتے ہو تو راستے پر تمہارا یہ چلنا طریقت ہے اور جب منزل مقصود پر پہنچ جاؤ تو یہ حقیقت ہے۔ اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے: **لو ظهرت الحقائق بطلت الشرائع** (اگر حقائق ظاہر ہو جائیں تو شرائع باطل ہو جائیں)۔ یہ ایسا ہے جیسے تانبہ سونا بن جائے یا اصل میں ہی سونا ہو، تو اسے نہ علم کیمیا کی ضرورت ہے جو کہ شریعت ہے اور نہ کیمیا کو تانبے پر ملنے کی ضرورت ہے جو طریقت ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ منزل پر پہنچنے کے بعد رہنما کی طلب قبیح ہے اور منزل پر پہنچنے سے پہلے رہنما کو ترک کرنا مذموم ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ شریعت کسی استاد یا کتاب سے علم کیمیا سیکھنے کی مانند ہے، طریقت کیمیا کو تانبے پر ملنے کی مانند ہے اور تانبے کا سونا بن جانا حقیقت ہے۔ کیمیا دان کیمیا کے علم پر خوش ہوتے ہیں، کیمیا گر کیمیا گری پر خوش ہوتے ہیں کہ ہم یہ کام کر لیتے ہیں اور

حقیقت تک پہنچ جانے والے حقیقت پر خوش ہوتے ہیں کہ ہم سونا بن گئے ہیں اور کیمیا دانی و کیمیا گری سے آزاد ہو گئے ہیں اور ہم عتقاء اللہ (یعنی اللہ کے آزاد کردہ لوگ) ہیں۔ **کل حزب بما لدیھم فرحون** (ہر گروہ اس چیز پر خوش ہے جو اس کے پاس ہے)۔ یا پھر شریعت کی مثال علم طب سیکھنے کی مانند ہے اور طریقت علم طب کے مطابق پرہیز کرنے اور دوا کھانے کی مانند ہے اور حقیقت ابدی صحت حاصل کرنے اور ان دونوں سے فارغ ہو جانے کی مانند ہے۔ جب آدمی اس زندگی سے مرجاتا ہے تو شریعت اور طریقت اس سے منقطع ہو جاتے ہیں اور حقیقت باقی رہ جاتی ہے۔ اگر وہ حقیقت کو پا چکا ہو تو یہ نعرہ لگاتا ہے: **یَا لَیۡتَ قَوۡمِیۡ یَعۡلَمُوۡنَ بِمَا غَفَرَلِیۡ رَبِّی** (کاش میری قوم جان لیتی کہ میرے رب نے مجھے معاف کر دیا۔ یاسین: 27-26) اور اگر حقیقت کو نہ پا سکا ہو تو یہ نعرہ لگاتا ہے: **یَالَیۡتَنِیۡ لَمۡ اُوۡتِیَ کِتَابِیَہۡ وَلَمۡ اَدۡرِ مَا حِسَابِیَہۡ یَا لَیۡتَھَا کَانَتِ الۡقَاضِیَۃَ مَا اَغۡنٰی عَنِّیۡ مَالِیَہۡ ھَلَکَ عَنِّیۡ سُلۡطَانِیَہ** (کاش میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا گیا ہوتا اور میں یہ نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے، کاش میرا خاتمہ ہی ہو گیا ہوتا، میرا مال میرے کام نہیں آیا اور میرا تسلط اور اقتدار بھی ہلاک ہو گیا۔ الحاقہ: 25-29) شریعت علم ہے، طریقت عمل ہے اور حقیقت اللہ تک پہنچ جانا ہے۔ **فَمَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡ ا لِقَاءَ رَبِّہٖ فَلۡیَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحاً وَلَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖ اَحَداً** (جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو وہ عمل صالح کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ کہف: 110)

قارئین محترم! اب آپ خود انصاف فرمائیں کہ رومی کیا بات کہہ رہے ہیں اور علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے اس کو کس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ رومی کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں کہ:

"چون آدمی از این حیات میرد شریعت و طریقت از او منقطع شود و حقیقت ماند"

"جب آدمی اس زندگی سے مرجاتا ہے تو شریعت اور طریقت اس سے منقطع ہو جاتے ہیں اور حقیقت باقی رہ جاتی ہے"۔ رومی کتنی صراحت کے ساتھ یہ کہہ رہے ہیں کہ شریعت اور طریقت پر چلنا زندگی بھر لازمی ہے، یہ صرف اس صورت میں منقطع ہوتی ہیں جب انسان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور وہ اس دنیا سے گزر جاتا ہے۔ آخر میں رومی اللہ کی ملاقات کی امید رکھنے والوں کو اس آیت کی یاد آوری کرا رہے ہیں کہ زندگی بھر عمل صالح اور اللہ کی عبادت کرتے رہیں اور کسی کو اپنے رب کی عبادت میں شریک نہ کریں)۔

یہاں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اذا ظہرت الحقائق بطلت الشرائع کا جملہ جو علامہ نجفی دام ظلہ نے نقل کیا اس میں بھی بہت بڑی اور نہایت واضح غلطی کی ہے۔ اصل جملہ یہ ہے: **لو ظھرت الحقائق بطلت الشرائع** جس کے معنی ہیں اگر حقائق ظاہر ہو جائیں تو شریعتیں باطل ہو جائیں۔ یہ جملہ شرطیہ ہے جس میں شرط کے بیان کے لیے **لو** کا لفظ استعمال ہوا ہے جبکہ علامہ صاحب نے **لو** کی جگہ **اذا** لکھ دیا ہے۔ قواعد عربی کے مطابق جب کسی شرط کو **لو** کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس شرط کا پورا ہونا محال اور ناممکن ہے، نہ شرط پوری ہوگی نہ مشروط کبھی وقوع پذیر ہوگا۔ جیسے **لَوْ كَانَ فِيْهِمَا آلِهَة اِلَّا اللهُ لَفَسَدَتَا** (اگر زمین اور آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو دونوں تباہ و برباد ہو جاتے۔ انبیاء :22) اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوں گے نہ زمین و آسمان تباہ و برباد ہوں گے۔ رومی کے جملے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں نہ حقائق ظاہر ہوں گے نہ شریعت باطل ہوگی، بلکہ انسان کے مرنے پر شریعت اور طریقت منقطع ہو جاتے ہیں اور حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے **لو** (یعنی اگر) کی جگہ **اذا** (یعنی جب) لگا کر ساری بات ہی بدل کر رکھ دی۔ ہم نہیں جانتے کہ انہوں نے یہ غلطی دانستہ کی ہے یا نادانستہ؟ اگر نادانستہ کی ہے تو بھی بہت بڑی غلطی ہے اور اگر دانستہ کی ہے تو یہ غلطی نہیں بلکہ خلاف امانت وعدالت ہے۔

شریعت اور حقیقت کے بارے میں رومی کی رائے جان لینے کے بعد اب تصوف کے امام ابوالقاسم قشیری کا نظریہ بھی ملاحظہ فرمالیں: وہ رسالہ قشیریہ میں لکھتے ہیں:

الشريعة و الحقيقة: الشريعة امر بالتزام العبودية و الحقيقة مشاهدة لربوبية، و كل شريعة غير مؤيدة بالحقيقة فامرها غير مقبول، و كل حقيقة غير مقيدة بالشريعة فامرها غير محصول۔ و الشريعة جائت بتكليف من الخالق و الحقيقة انباء عن تصريف الحق، فالشريعة ان تعبده و الحقيقة ان تشهده، و الشريعة قيام بما امر و الحقيقة شهود لما قضى و قدر و اخفى و اظهر۔ سمعت الاستاذ ابا علي الدقاق رحمه الله يقول: اياك نعبد حفظ للشريعه و اياك نستعين اقرار بالحقيقة. و اعلم ان الشريعة حقيقة من حيث انها وجبت بامره و الحقيقة ايضا

شریعۃ من حیث ان المعارف بہ سبحانہ ایضا وجبت بامرہ۔صفحہ 83-82

ترجمہ: شریعت بندگی کو اپنے اوپر لازم کر لینے کا حکم ہے اور حقیقت مشاہدہ ربوبیت کا نام ہے۔ ہر شریعت جسے حقیقت کی تائید حاصل نہ ہو وہ قبول نہیں ہوتی اور ہر حقیقت جو شریعت کی پابند نہ ہو لا حاصل ہوتی ہے۔ شریعت خالق کی طرف سے تکلیف لے کر آئی ہے اور حقیقت خالق کے تصرف کی خبر دیتی ہے۔شریعت یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور حقیقت یہ ہے کہ تم اللہ کا مشاہدہ کرو۔ میں نے استاد ابو علی الدقاق سے سنا کہ وہ کہتے تھے **ایاک نعبد شریعت** کی حفاظت ہے اور **ایاک نستعین** حقیقت کا اقرار ہے۔اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ شریعت حقیقت ہی ہے اس لیے کہ یہ اللہ کے حکم سے واجب ہوئی ہے اور حقیقت شریعت ہی ہے اس لحاظ سے کہ اللہ کی معرفت حاصل کرنا بھی اسی کے حکم سے واجب ہوا ہے۔

اب قارئین محترم خود فیصلہ کریں کہ شریعت و حقیقت کی جو تصویر تصوف کی اس مستند و معتبر کتاب سے سامنے آتی ہے وہ اس تصویر سے کتنی مختلف ہے جو علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے پیش کی ہے۔

قارئین محترم ! شریعت و حقیقت کی ایک اور خوبصورت تشریح ملا حظہ فرمائیے: ایک مرتبہ کچھ احباب کی محفل میں بیٹھے ہوئے شریعت اور حقیقت کی بات چل نکلی ۔وہاں موجود ایک دوست جو جناب واصف علی واصف کے ارادتمند تھے، کہنے لگے کہ واصف علی واصف سے شریعت و حقیقت کا فرق پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا: کربلا میں امام حسین علیہ السلام اور ان کے انصار نے بھی نماز پڑھی اور لشکر یزید نے بھی نماز پڑھی۔لشکر یزید کی نماز شریعت تھی اور امام حسین علیہ السلام اور ان کے انصار کی نماز حقیقت تھی۔مطلب یہ کہ لشکر یزید نے حکم شریعت کے مطابق نماز ادا کر کے اپنا واجب تو ادا کر دیا لیکن اس نماز سے نہ قرب خدا حاصل ہوا نہ ہی وہ معراج المومن تھی۔وہ ایک ایسی نماز تھی جس میں نماز کا ظاہری ڈھانچہ تو تھا لیکن نماز کی حقیقت اور نماز کی روح اس میں نہ تھی۔نماز کی حقیقت جو معراج المومن ہے وہ امام حسین علیہ السلام اور ان کے اصحاب کی نماز تھی۔

اردو کے مشہور شاعر اکبر الہ آبادی نے اپنے ایک شعر میں شریعت اور طریقت کا فرق اس طرح بیان کیا ہے:

قرآن رہے پیش نظر یہ ہے شریعت   اللہ رہے پیش نظر یہ ہے طریقت

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے اس بحث کے آخر پر یہ بھی کہہ دیا: آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں۔ علامہ صاحب دام ظلہ کی خدمت میں نہایت ادب اور احترام سے عرض ہے:

آپ بھی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں۔

اسی طرح علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے صفحہ 72 پر لکھا کہ: ''حقیقت الامر یہ ہے کہ جو قوم میدان عمل میں قدم رکھنے سے ہچکچاتی ہو اور اس میں عمل کا فقدان ہو جائے اور تنزل اور زوال کی طرف گامزن ہو اور زمانہ حاضرہ کے علمی و عملی مسائل کے حل سے قاصر و عاجز ہو وہ نظام خانقاہی کی آغوش میں پناہ لیتی ہے''۔ آگے چل کر پرویز کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ: ''تصوف کسی قوم کے قومی و ملی انحطاط اور زوال پذیری کی علامت ہے، خدا اس سے ہماری قوم کو محفوظ رکھے۔''

ہم علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کے اس قیاس بے اساس اور پرویز کی رائے پر صرف اتنا تبصرہ کریں گے کہ انقلاب ایران جیسا عظیم انقلاب امام خمینیؒ کی قیادت میں آیا جو ایک فقیہ اور سیاسی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عارف بھی تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی شخصیت کا عرفانی پہلو فقہی اور سیاسی پہلوؤں پر حاوی تھا۔ اگر وہ روایتی فقیہ اور روایتی سیاسی رہنما ہوتے تو کبھی یہ انقلاب برپا نہ کر سکتے۔ اس انقلاب کے لیے عوام کی فکری تربیت بھی آیت اللہ مرتضیٰ مطہری شہید جیسے عرفاء نے کی۔ اس انقلاب میں آیت اللہ صادقی تہرانی جیسے قرآنی عارف و فقیہ امام خمینیؒ کے دست راست تھے۔ ایران عراق جنگ میں نمایاں کردار ادا کرنے والے ڈاکٹر مصطفی چمران شہید جہاں ایک نامور سائنس دان اور کمانڈو مجاہد تھے وہاں ان کی شخصیت کا عرفانی پہلو بھی آشنایان حال سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اسی طرح انقلاب کی تحریک کے دوران اور انقلاب کے بعد سے اب تک کی مدت میں، زمانہ حاضرہ کے علمی و عملی مسائل کے حل کے لیے ایران میں جو علمی اور فکری کام ہوا ہے، اس کے حجم پر نظر ڈالیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ امام خمینیؒ کے سیاسی فلسفہ (نظریہ ولایت فقیہ)، انقلاب کے بعد قائم ہونے والے سیاسی نظام اور انتہائی سخت گیر آمرانہ و جابرانہ انداز حکمرانی سے اختلاف رائے کی بہت زیادہ گنجائش موجود ہے۔ لیکن انقلاب کی عظمت اور اس کے نتیجہ میں ہونے والے علمی اور فکری کام کی عظمت سے انکار کوئی کور چشم ہی کرے گا۔

علامہ سید محمد حسین طباطبائی ،آیت اللہ العظمیٰ علامہ ڈاکٹر محمد صادقی تہرانی ،علامہ حسن مصطفوی، آیت اللہ مرتضیٰ مطہری شہید ،علامہ سید محمد حسین حسینی تہرانی اور علامہ محمد تقی جعفری (رضوان اللہ علیہم) فقیہ اور عارف تھے۔ان میں سے ہر ایک کے علمی کام کے حجم کو دیکھنے کے بعد کوئی عادل انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ زمانے کے علمی اور عملی مسائل حل کرنے سے قاصر تھے۔

علامہ اقبال بھی نہ صرف صوفی منش اور صوفیاء کے عقیدت مند بلکہ قادریہ سلسلہ سے بیعت تھے۔ پاکستان کا وجود ان ہی کی سوچ کا مرہون منت ہے۔مولوی تو قیام پاکستان کے مخالف تھے۔اسی طرح انقلاب ایران میں بھی فکر اقبال کی تاثیر کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر علی شریعتی جنہوں نے نوجوانوں کی فکری تربیت میں اہم کردار ادا کیا وہ اقبال کے سرگرم عقیدتمند تھے۔ان کی کتاب ما و اقبال ہمارے اس دعویٰ کی دلیل ہے۔

مزید آگے چل کر علامہ صاحب فرماتے ہیں:اسی بنا پر علامہ اقبال نے قوم کو یہ مشورہ دیا تھا:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری　　　کہ فکر خانقاہی ہے فقط اندوہ دل گیری

(علامہ صاحب نے علامہ اقبال کے شعر کا دوسرا مصرع اس طرح سے لکھا ہے:''کہ نظام خانقاہی ہے فقط اندوہ دل گیری''جو کہ درست نہیں ہے)

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ علامہ اقبال نے یہ مشورہ قوم کو دیا تھا،اس لیے کہ قوم تو خانقاہوں میں نہیں بیٹھی تھی۔خانقاہوں میں صوفیاء و عرفاء تھے اور علامہ اقبال نے یہ مشورہ انہی کو دیا تھا۔اس کی وجہ بھی بالکل واضح ہے کہ علامہ اقبال کو رسم شبیری ادا کرنے کی کوئی توقع تھی تو خانقاہ نشین عرفاء و صوفیاء سے تھی،جن کے دل حب دنیا اور اس کے ناپاک اثرات سے آلودہ نہیں ہوتے ہیں۔اسی لیے انہوں نے ان سے اپیل کی کہ خانقاہوں سے نکل کر قوم کی کشتی کی ناخدائی کا فرض ادا کریں۔عرفا و صوفیاء کے علاوہ جو باقی دو گروہ تھے یعنی ملا اور فلسفی،ان سے تو علامہ اقبال کو سرے سے کوئی امید ہی نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا:

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو　　　یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد (بال جبریل)

اس کے برعکس علامہ اقبال نے عارف کے بارے میں فرمایا:

دم عارف نسیم صبح دم ہے — اسی سے ریشہ معنی میں نم ہے

اگر کوئی شعیب آئے میسر — شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

(بال جبریل: رباعیات)

ملا کے بارے میں ان کا یہ مصرع بھی معروف ہے: دین ملا فی سبیل اللہ فساد

نیز ایک بہت بڑے ملا اور فلسفی، مشہور مفسر، علامہ رازی کے بارے میں اقبال نے فرمایا:

چون سرمہ رازی را از دیدہ فروشستم — تقدیر امم دیدم پنہاں بہ کتاب اندر

ترجمہ: جب میں نے اپنی آنکھوں پر لگا ہوا رازی کا سرمہ دھو ڈالا

تو مجھے کتاب اللہ میں قوموں کی تقدیر نظر آئی۔ (جاوید نامہ: نوائے سروش)

☆☆☆

ساتویں باب کا جائزہ

ساتویں باب میں علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے کچھ شبہات کا جواب دینے کی سعی فرمائی ہے۔ لیکن سب کچی، کمزور اور خلاف واقع گفتگو۔

پہلا شبہ:

تصوف کے سارے سلسلے حضرت علی تک پہنچتے ہیں۔ چشتیہ قادریہ اور سہروردیہ کا سلسلہ حسن بصری سے حضرت علی تک پہنچتا ہے۔ پھر تصوف غلط کیسے ہوسکتا ہے۔

اس شبہ کے جواب میں پہلے فرماتے ہیں کہ یہ شبہ سراسر لاعلمی اور جہالت پر مبنی ہے۔ پھر تضادات سے بھرپور گفتگو فرماتے ہیں۔ پہلے لکھتے ہیں کہ حسن بصری کی حضرت علی علیہ السلام سے ملاقات ہی ثابت نہیں ہے۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ علامہ مجلسی اور دوسرے محدثین و مؤرخین نے لکھا ہے کہ ایک بار حسن بصری وضو کر رہا تھا۔ وہاں سے حضرت علی کا گزر ہوا۔ آپ نے فرمایا حسن وضو صحیح طریقہ پر کر۔ اس پر حسن بصری نے چیں بہ جبین ہو کر کہا کہ کل آپ نے ان لوگوں کو قتل کیا جو صحیح وضو کرتے تھے (ان کا اشارہ

اصحابِ جمل کی طرف تھا) اور آج مجھ پر اعتراض کر رہے ہیں؟ اس پر حضرت علی علیہ السلام نے کہا کہ اگر تمہیں ان لوگوں سے اتنی ہمدردی تھی تو ان کی مدد کیوں نہ کی؟ اس کے جواب میں حسن بصری نے کہا کہ خدا کی قسم میں بالکل تیار ہو کر اور تلوار بکف ہو کر ان کی ہمدردی میں آپ کے خلاف جنگ کرنے کے ارادے سے گھر سے نکلا۔ مگر راستہ میں ایک ہاتف غیبی کی آواز آئی: ''القاتل والمقتول کلاھما فی النار (کہ اس جنگ میں جو قاتل ہوں گے وہ بھی اور جو مقتول ہوں گے وہ بھی، سب جہنم میں جائیں گے''۔ یہ آواز سن کر میں واپس آ گیا۔ یہ سن کر حضرت علی بولے: اے حسن! کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہاتف (منادی) کون تھا؟ کہا: نہیں۔ فرمایا: وہ تیرا بھائی شیطان تھا۔ (آن برادرت شیطان بود) اور اس بات میں اس نے سچ کہا ہے'' میرے خلاف جنگ لڑنے والوں کے قاتل ومقتول دونوں جہنم میں جائیں گے''۔

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ پہلے اس بات کو واضح کریں کہ حضرت علی علیہ السلام اور حسن بصری کی ملاقات ہوئی یا نہیں؟ پہلے یہ کہنا کہ حسن بصری کی حضرت علی علیہ السلام سے ملاقات ہی نہیں ہوئی اور پھر حضرت علی علیہ السلام اور حسن بصری کا یہ مکالمہ نقل کرنا، کیا یہ کھلا تضاد نہیں؟ اگر حسن بصری کی حضرت علی علیہ السلام سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تو پھر علامہ مجلسی اور دوسرے محدثین ومؤرخین کا لکھا ہوا حضرت علی اور حسن بصری کا مکالمہ درج نہیں کرنا چاہیے تھا۔

مزید یہ کہ تھوڑا سا غور وفکر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولا علی (علیہ السلام) اور حسن بصری کے درمیان یہ مکالمہ ایک گھڑی ہوئی کہانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس مکالمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حسن بصری غلط طریقے سے وضو کر رہا تھا اور مولا علی (علیہ السلام) نے اسے کہا: حسن! وضو صحیح طریقہ سے کر۔ معمولی سوچ بچار کرنے والا شخص جانتا ہے کہ کسی کی غلطی کی اصلاح کرنے کے لیے آئمہ معصومین علیہم السلام کا یہ انداز کبھی نہیں رہا۔ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کا یہ واقعہ سب قارئین کو یاد ہو گا کہ انہوں نے مسجد میں ایک بوڑھے کو دیکھا جو وضو غلط طریقے سے کر رہا تھا۔ ان دونوں شہزادوں نے اسے یہ نہیں کہا کہ انکل آپ کا وضو غلط ہے، ٹھیک طرح سے وضو کریں۔ بلکہ انہوں نے اس سے کہا کہ ہم دونوں وضو کرتے ہیں آپ دیکھ کر بتائیں کہ ہمارا وضو صحیح ہے یا غلط۔ پھر دونوں نے وضو کیا اور بوڑھے نے ان کا وضو دیکھا تو اسے احساس ہو گیا کہ اس کا وضو غلط تھا۔

دوسری بات یہ کہ اس مکالمہ کے مطابق حسن بصری تلوار لے کر مولا علی (علیہ السلام) کے خلاف لڑنے نکلا تو شیطان نے ایک آواز دی جس سے حسن بصری سمجھ گیا کہ وہ جہنم کے راستے پر جا رہا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ قرآن واضح طور پر کہہ رہا ہے کہ شیطان گمراہی میں دھکیلتا ہے گمراہی سے روکتا نہیں، جہنم کی طرف بلاتا ہے، جہنم کی طرف جانے والوں کو روکتا نہیں۔ اِنَّمَا یَدْعُوا حِزْبَهٗ لِیَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحَابِ السَّعِیْرِ۔ (وہ اپنی جماعت کو بلاتا ہے تا کہ وہ اہل جہنم ہو جائیں۔ فاطر 6:)۔ جبکہ اس واقع سے ثابت ہوتا ہے کہ حسن بصری جہنم کی راہ پر چل پڑا تھا مگر شیطان نے اسے گمراہی اور جہنم کے راستے سے روک لیا۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ مکالمہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

فرض کر لیں کہ حسن بصری حضرت علی علیہ السلام کا مخالف تھا۔ اس بات کی کیا دلیل ہے کہ وہ آخر تک ان کا مخالف رہا۔ ہمارے پاس جناب حر کی مثال موجود ہے۔ وہ یزید کی فوج کے ایک کمانڈر تھے۔ بعد میں تائب ہو کر امام حسین علیہ السلام کے لشکر میں آ گئے اور شہدائے کربلا میں شامل ہو گئے۔ اسی طرح جناب زہیر بن قین عثمانی تھے مگر اللہ نے انہیں راہ راست کی ہدایت کر دی اور وہ انصار امام حسین علیہ السلام میں شامل ہو کر شہدائے کربلا کے زمرے میں داخل ہو گئے۔ ایسی اور بھی بہت سے مثالیں موجود ہیں۔

سید علی ہجویری جو داتا گنج بخش کے لقب سے مشہور ہیں، اپنی کتاب کشف المحجوب میں حسن بصری کا امام حسن علیہ السلام کو لکھا ہوا خط نقل کرتے ہیں:

السلام علیک یا ابن رسول اللہ و قرۃ عینہ و رحمت اللہ و برکاتہ۔ اما بعد فانکم معاشر بنی ھاشم کالفلک الجاریہ فی بحر لجی و مصابیح الدجی و اعلام الھدی و آئمۃ القادہ الذین من تبعھم نجی کسفینہ نوح المشحونہ التی یئول الیھا المومنون وینجو فیھا لمتمسکون۔ فما قولک یا ابن رسول اللہ فی حیر تنافی القدر و اختلافنا فی الاستطاعہ لتعلمنا بما تاکد علیہ رایک فانکم ذریۃ بعضھا من بعض، بعلم اللہ علمتم و ھو االشاھد علیکم و انتم شھداء اللہ علی الناس۔ و السلام۔ (اردو ترجمہ صفحہ 129)

ترجمہ: اے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فرزند اور نور چشم! آپ پر اللہ تعالیٰ کی سلامتی، رحمت اور

برکت ہو۔ امابعد! واضح ہو کہ آپ بنو ہاشم ہیں۔ آپ کی مثال بحر زخار میں کشتیوں کی ہے اور ظلمت میں روشنی اور ہدایات کے نشانات کی۔ آپ وہ پیشوا ہیں کہ جو آپ کی پیروی کرے وہ نجات پائے جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کے ایماندار پیروکاروں نے ان کی طرف توجہ کی اور کشتی کے ذریعے نجات پائی۔ کیا فرماتے ہیں آپ قدر کے پر پیچ مسئلہ پر اور اس بحث پر کہ آدمی محض مجبور ہے یا اسے افعال پر اختیار و استطاعت ہے۔ آپ فرزند پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اللہ نے آپ کو علم دیا ہے، وہ آپ کا محافظ ہے اور آپ مخلوق کے محافظ ہیں۔ والسلام۔

قارئین محترم خود فیصلہ فرمائیں کہ آیا کوئی دشمن اہل بیت امام حسن علیہ السلام سے رہنمائی طلب کرتے ہوئے ان کی خدمت میں اس طرح کا خط لکھ سکتا ہے؟

ہم اس سلسلے میں کلام کا اختتام مرتضیٰ مطہری شہید کے ایک بیان پر کرتے ہیں:

معروف کرخی اهل کرخ بغداد است، ولی از اینکه نام پدرش فیروز است بنظر میرسد که ایرانی الاصل است۔ این مرد از معاریف و مشاهیر عرفاء است۔ میگویند پدر و مادرش نصرانی بودندو خودش بد ست حضرت رضا علیه السلام مسلمان شد و از آنحضرت استفاده کرد۔ بسیاری از سلاسل طریقت، بر حسب ادعای عرفاء، به معروف کرخی و بوسیله او به حضرت رضا علیه السلام میرسدو از طریق آنحضرت به آئمه پیشین تا رسول الله صلی الله علیه و آله میرسدو بدین جهت این سلسله را سلسلة الذهب (رشته طلائی) میخوانند۔ وفات معروف در حدود 206-200 هجری بوده است۔

ترجمہ: معروف کرخی اہل بغداد ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے والد کا نام فیروز ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایرانی الاصل ہیں۔ یہ معروف اور مشہور عرفاء میں سے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے والدین نصرانی تھے لیکن یہ خود امام رضا علیہ السلام کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور ان سے کسب فیض کیا۔ صوفیاء کے دعویٰ کے مطابق تصوف کے بہت سے سلسلے معروف کرخی کے ذریعے امام رضا علیہ السلام تک پہنچتے ہیں اور ان کے ذریعے ان کے پیشرو آئمہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتے ہیں۔ اس لیے اس سلسلہ کو

سلسلۃ الذہب (سنہری سلسلہ) کہا جاتا ہے۔معروف کرخی کی وفات 200 سے 206ہجری کے لگ بھگ ہوئی۔ (مجموعہ آثار استاد مطہری14:563)

دوسرا شبہ:

سب بڑے بڑے صوفیاء نے حضرت علی (علیہ السلام) کی مدح کی ہے اور ان کی مدح میں قصیدے لکھے ہیں۔

اس شبہ کے جواب میں فرماتے ہیں: ''باقی رہا اکابر صوفیہ کا مدح شاہ ولایت کرنا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے حضرت علی کی مدح کی ہے۔مگر یہ بھی یاد رکھیں کہ انہوں نے دشمنان علی کی بھی ستائش کی ہے''۔علامہ نجفی صاحب دام ظلہ جیسی صاحب علم شخصیت کا یہ ''عالمانہ جواب'' دیکھ کر طبیعت جھوم جھوم گئی۔سوال یہ ہے کہ کیا جن کو ہم دشمنان علی مانتے ہیں، اکابر صوفیاء بھی ان کو دشمن علی مانتے تھے اور پھر دشمن علی مان کر ان کی ستائش کی ہے؟ یا انہیں اصحاب رسول اور خلفائے راشدین مان کر ان کی تعریف کی ہے؟ مثال کے طور پر فریدالدین عطار اپنی کتاب مثنوی منطق الطیر کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد سے کرتے ہیں۔اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود وسلام، پھر خلفائے راشدین کی مدح وثنا میں اشعار ہیں۔لہٰذا یہ کہنا کہ انہوں نے ان لوگوں کی بھی ستائش کی ہے جو ہمارے عقیدے کے مطابق دشمنان اہل بیت ہیں، ان کی مدح وثنائے مولا علی کی قدر و قیمت کو کم نہیں کرتا۔اس طریقے سے ان کی عقیدت ومحبت کی نفی کرنا محض تعصب،تنگ نظری اور عناد ہے اور کچھ نہیں۔

اس کے بعد صوفیاء کی مدح وثنائے مولا علی کی قدر و قیمت گھٹانے کے لیے مولا علی کے تین دشمنوں یعنی امیر شام،عمرو عاص اور یزید کا ایک ایک شعر لکھ دیا جو انہوں نے مولا علی علیہ السلام کی تعریف میں کہا اور پھر اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کیا ان اشعار کا یہ مطلب ہے کہ یہ لوگ محبان علی تھے؟ علامہ نجفی کی یہ بات بھی ایک گمراہ کن مغالطے کے سوا کچھ نہیں۔پہلی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں بغض علی اتنا بھرا ہوا تھا کہ منبروں سے مولا علی کو گالیاں دیتے تھے، نہ صرف دیتے تھے بلکہ اسے عبادت کا حصہ بنا دیا تھا، ان سے یہ توقع کرنا کہ انہوں نے مولا علی کی تعریف میں اشعار کہے ہوں گے، بعید از قیاس ہے۔لیکن چلیں مان لیتے ہیں کہ مولا علی سے بہتر کوئی ممدوح انہیں نظر نہ آیا اس لیے انہوں نے مولا علی مدح میں شعر کہہ

دیئے۔لیکن ان کی ساری عملی زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ وہ مولا علی کے دشمن تھے، بلکہ ان اشعار میں بھی دشمنی کا اقرار نمایاں ہے کہ عمرو عاص کا شعر یہ ہے:

و فضیلة شهد العدو بفضلها والفضل ما شهدت به الاعداء

یعنی آپ کی فضیلت ایسی فضیلت ہے جس کی گواہی دشمن نے بھی دی ہے،

اور فضیلت ہوتی ہی وہ ہے جس کی گواہی دشمن بھی دے۔

سوال یہ ہے کہ اگر دشمنان علی نے بھی مدح مولا علی میں اشعار کہے ہیں تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جو بھی مدح مولا علی کرے گا وہ دشمن علی ہوگا۔ اگر کچھ دشمنان علی نے مولا علی کی مدح میں کچھ اشعار کہے ہیں تو کیا اس سے محبان علی کی مدح وثنائے مولا علی کی قدر و قیمت کم ہو جائے گی۔ **ما لكم كيف تحكمون**۔ ان دشمنان اہل بیت کے ایک ایک شعر کو دیکھ کر مدح مولا علی میں صوفیاء کے اشعار کے دفتروں کے دفتروں کی ناقدری اور تحقیر کرنا اور انہیں نظرانداز کر دینا واضح طور پر خلاف امانت وعدالت ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص سورج کا اعتراف نہ کرنا چاہے اور اپنی آنکھیں بند کر لے اور پھر کہے کہ سورج نہیں ہے۔

یہاں اور نکتہ بھی قابل توجہ ہے۔ علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے مدح اہل بیت میں صوفیاء وعرفاء کے اشعار کی قدر و قیمت گھٹانے کے لیے مذکورہ بالا افراد کا ایک ایک شعر پیش کیا اور یہ کہہ کر پیش کیا:

''چنانچہ سب سے پہلے معاویہ نے جناب کی بارگاہ میں اس طرح خراج عقیدت پیش کیا''۔

''آخر میں عمرو العاص نے اپنی عقیدت کا گلدستہ اس طرح پیش کیا''۔ علامہ نجفی صاحب صوفیاء وعرفاء کے عقیدت ومحبت سے لبریز اشعار کے باوجود اصرار فرما رہے ہیں کہ وہ دشمنان اہل بیت ہیں اور درجہ اول کے دشمنان علی کا ایک ایک شعر نقل کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ خراج عقیدت پیش کیا، گلدستہ عقیدت پیش کیا۔ یعنی وہ مولا علی کے عقیدت مند تھے اور عقیدت کا اظہار کر رہے تھے؟

بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی است

صفحہ 40 پر ''سب صوفیاء دشمن اہل بیت ہیں'' کے ذیل میں ہم نے کافی تفصیل سے صوفیاء کے محبت وعقیدت کے نمونے اور شواہد دکھا دیئے ہیں۔ رومی اور ولایت علی کے عنوان کو بھی آپ ملاحظہ کر چکے

ہیں۔ یہاں چنداور اشعار ملاحظہ فرمائیں۔فریدالدین عطار کا یہ شعر پہلے بھی آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں:

تو گر خواہی کہ دانی عاشقان را　　طریق رفتن آن سالکان را

بہ راہ حیدر صفدر روان شو　　تو ہم در راہ آن چون عاشقان شو

ترجمہ: اگر تم اللہ کے عاشقوں (یعنی عرفاء وصوفیاء) کو پہچاننا چاہتے ہو، اوران کے راستے کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہوتو حیدر صفدر کے راستے پر چلنا شروع کر دو،تم بھی ان کے راستے پر چل کراللہ کے عاشقوں کی مانند ہو جاؤ۔　　(عطار: سی فصل)

ابوسعید ابوالخیر:

ازآن روزی کہ مارا آفریدی　　بغیر از معصیت چیزی ندیدی

خداوندا بحق ہشت وچارت　　زما بگذر شتر دیدی ندیدی

ترجمہ: یااللہ جب سے تونے ہمیں پیدا کیا ہے،

ہم سے گناہ اور نافرمانی کے سوا تونے کچھ نہیں دیکھا۔

تجھے تیرے آٹھ اور چار (یعنی بارہ اماموں) کا واسطہ،

ہمارے گناہوں کوان دیکھا کر دے اور ہمیں معاف کر دے۔

شیخ سعدی کے عقیدت مندانہ اشعار:

خدایا بحق بنی فاطمہ　　کہ برقول ایمان کنی خاتمہ

اگر دعوتم رد کنی ور قبول　　من ودست وداماں آل رسول

ترجمہ: یااللہ تجھے فاطمہ زہراء کے بیٹوں کا واسطہ ہمارا خاتمہ ایمان پر کرنا،

چاہے تو میری دعا قبول کرے یا رد کرے میرا ہاتھ آل رسول کے دامن میں رہے گا۔

مولا علی کے حضور عطار کا ھدیہ عقیدت:

خواجہ حق پیشوای راستین　　کوہ حلم وباب علم وقطب دین

مرتضیٰ ومجتبیٰ جفت بتول　　خواجہ معصوم داماد رسول

ہم زاقضاکم علی جان آگہ است　　ہم علی ملموس فی ذات اللہ است

ترجمہ: اہل حق کے سرداراور سچے پیشوا، حلم کا پہاڑ، علم کا دروازہ اور دین کا مرکز ومحور، مرتضی، مجتبیٰ، بتول کے شوہر، معصوم سردار، رسول کے داماد۔ ہماری جان رسول اللہ کے اس فرمان سے آگاہ ہے کہ علی تم میں سب سے بڑے قاضی ہیں، اوراس حقیقت سے بھی آگاہ ہے کہ مولا علی کی ذات اللہ کی ذات سے جدانہیں ہے۔

عطار کے ان اشعار میں ''خواجہ معصوم'' کے الفاظ بہت قابل توجہ ہیں۔خواجہ سردار کو کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے خواجہ معصوم کے معنی امام معصوم ہوں گے۔

امام حسین علیہ السلام کے بارے میں کہتے ہیں:

امامی کافتاب خافقین است　　امام از ماہ تاماہی حسین است

چوخورشیدی جہان راخسروآمد　　کہ نہ معصوم پاکش پس روآمد

ترجمہ: آپ وہ امام ہیں جومشرق ومغرب کا سورج ہے، چاند سے لے کر مچھلی تک (یعنی آسمان وزمین کی) ہر چیز کا امام حسین ہے، آپ اس کائنات کے ایسے بادشاہ ہیں جیسے سورج دن کا بادشاہ ہوتا ہے، آپ ایسے امام ہیں جن کی ذریت سے نو پاک اور معصوم امام پیدا ہوئے۔

اس شعر میں بھی امام حسین علیہ السلام کی ذریت سے نومعصوم اماموں کا ذکر واضح الفاظ میں موجود ہے۔

شیخ فریدالدین عطار اپنی ایک اور کتاب الٰہی نامہ میں مولا علی (علیہ السلام) کی شان میں اس طرح ہدیہ عقیدت پیش کررہے ہیں:

زعشق مرتضیٰ مقصود یابی　　زعشق مرتضیٰ معبود یابی

عشق مرتضیٰ کی بدولت تم مقصود کو پاسکتے ہو، عشق مرتضیٰ کی بدولت تم معبود کو پاسکتے ہو۔

زعشق مرتضیٰ گردی سلیمان　　دہی برجن وانس وطیر فرمان

عشق مرتضیٰ کی بدولت تم سلیمان نبی جیسے بادشاہ بن سکتے ہو۔

اور جنات، انسانوں اور پرندوں پر حکومت کر سکتے ہو۔

زعشق مرتضیٰ آگاہ باشی   بمعنی ہر دو عالم شاہ باشی

مرتضیٰ کے عشق کی بدولت تم آگاہ اور عارف بن سکتے ہو اور

حقیقت میں دونوں جہانوں کے بادشاہ بن سکتے ہو۔

زعشق مرتضیٰ در جوش باشی   بہ نزد جاہلاں خاموش باشی

عشق مرتضیٰ کی بدولت تم میں جوش پیدا ہو جائے گا، مگر تم جاہلوں کے سامنے خاموش رہنا۔

زعشق مرتضیٰ در باز جان را   وداعی کن ہمہ ملک جہان را

مرتضیٰ کے عشق میں جان کی بازی ہار جاؤ اور ساری دنیا کی حکومت کو ترک کر دو۔

زعشق مرتضیٰ گر در خروشی   ز دستش شربت کوثر بنوشی

اگر تم عشق مرتضیٰ کی وجہ سے جوش و خروش میں آ جاؤ تو قیامت

کے دن انہی کے ہاتھ سے جام کوثر پیو گے۔

زعشق مرتضیٰ عطار باشی   مطیع حیدر کرار باشی

تم عشق مرتضیٰ کی بدولت عطار بن جاؤ گے (یعنی تم سے ہر وقت اس طرح عطر کی خوشبو آئے گی جس طرح عطر

فروش سے ہر وقت عطر کی خوشبو آتی ہے)

اور عشق مرتضیٰ کی بدولت تم حیدر کرار کے مطیع و فرمان بردار بن جاؤ گے۔

زعشق مرتضیٰ خورشید گردی   حقیقت زندہ جاوید گردی

تم عشق مرتضیٰ کی بدولت سورج بن جاؤ گے اور حقیقت میں

ابدی زندگی حاصل کر کے زندہ و جاوید ہو جاؤ گے۔

نشستہ عشق شاہ در جان عطار   بگوید سر آن را بر سر دار

شاہ کا عشق عطار کے دل و جان میں رچ بس چکا ہے جس کی وجہ سے

وہ دار پر بھی ان کے اسرار و کمالات کو بیان کر رہا ہے۔

ان اشعار میں عطار کا یہ مصرع خاص طور پر قابل توجہ ہے:

زعشق مرتضیٰ خورشید گردی یعنی تم عشق مرتضیٰ کی بدولت سورج بن جاؤ گے۔

شاید اسی مصرع کو پیش نظر رکھ کر علامہ اقبال نے مولا علی (علیہ السلام) کے بارے میں اس طرح اظہار عقیدت کیا ہے:

مسلم اول شہ مرداں علی عشق را سرمایہ ایمان علی

سب مسلمانوں میں درجہ اول کے مسلمان اور جوانمردوں کے بادشاہ علی ہیں،

عشق کے لیے ایمان کا سرمایہ علی ہیں۔

از ولائے دودمانش زندہ ام در جہاں مثل گوہر تابندہ ام

میں ان کی آل کی ولایت کی بدولت زندہ ہوں اور سارے جہان میں موتی کی طرح چمک رہا ہوں۔

ذرہ ام مہر منیر آن من است صد سحر اندر گریبان من است

میں ہوں تو ایک ذرہ لیکن روشن سورج کی مانند عزت و آبرو رکھتا ہوں

اور میرے گریبان میں ایک نہیں سینکڑوں صبحیں موجود ہیں۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا ھدیہ عقیدت:

امامت را کسی شاید شاہ اولیاء باشد بہ زہد و عصمت و دانش مثال انبیاء باشد

امامت کے شایان شان وہ ہوسکتا ہے جو شاہ اولیا ہو اور زہد و عصمت اور علم میں انبیاء جیسا ہو۔

امام دین کسی باشد کہ چوں تاج و کمر دادش بہ فرق ہل اتی تاج و کمر از انما باشد

امامت کے شایان شان وہ ہوسکتا ہے کہ جب اسے تاج اور کمر بند دینے کا وقت آئے

تو سورت ھل اتی اس کا تاج اور انما ولیکم اللہ اس کا کمر بند ہو۔

امام دیں کسی باشد کہ در وقت ولادت او بود در کعبہ و کعبہ زکعبش در صفا باشد

امامت کے شایان شان وہ ہوسکتا ہے جو ولادت کے وقت کعبہ میں ہو

اور کعبہ اس کے وجود کی پاکیزگی سے پاک ہو۔

امام حق کسی باشد کہ اودر طینت آدم   پیمبر را بہم بودہ ولایت را ولا باشد

امامت کے شایان شان وہ ہوسکتا ہے کہ جب آدم کی مٹی گوندھی گئی

تو وہ رسول کے ساتھ موجود ہو اور ولایت کا بھی ولی ہو

امام الحق کسی باشد کہ روز غزوہ خندق   بکشت آن عمرو کافر را کہ تا دین برملا باشد

امامت کے شایان شان وہ ہوسکتا ہے جو جنگ خندق کے دن

عمرو بن عبدود کو قتل کر دے تاکہ دین ظاہر و آشکار ہو جائے

امام حق کسی باشد کہ برکند او در خیبر   نبی گفتش کہ یا حیدر نگہبانت خدا باشد

امامت کے شایان شان وہ ہوسکتا ہے جو قلعہ خیبر کا دروازہ اکھاڑ پھینکے

اور جسے رسول یہ دعا دیں کہ خدا تمہارا نگہبان ہو۔

امام حق کسی باشد کہ بے امر خدا ہرگز   نہ کردہ ہیچ کاری او کہ آن کار خطا باشد

امامت کے شایان شان وہ ہوسکتا ہے جو خدا کے حکم کے بغیر کوئی کام نہ کرے،

اس نے کبھی کوئی ایسا کام نہ کیا ہو جو خطا ہو۔

امام حق کسی باشد کہ باشد ساقی کوثر   ہمو آب بقا ہست و ہمو شاہ ولا باشد

امامت کے شایان شان وہ ہوسکتا ہے جو ساقی کوثر ہو، وہی آب بقا ہے اور وہی شاہ ولایت ہو۔

امام حق کسی باشد کہ اندر جملہ قرآن   بہ ہر آیت کہ برخوانی در مدح و ثنا باشد

امامت کے شایان شان وہ ہوسکتا ہے کہ قرآن میں تم جو بھی آیت پڑھو اس میں اسی کی مدح و ثنا ہو۔

امام حق کسی باشد کہ باشد ہمسر زہراء   چناں رفعت کہ می بینی بجز حیدر کرا باشد

امامت کے شایان شان وہ ہوسکتا ہے جو حضرت فاطمہ زہراء کا شوہر ہو،

تم دیکھ سکتے ہو کہ یہ بلند درجہ حیدر کے سوا کس کو حاصل ہے۔ (نوائے صوفیہ صفحہ 124)

خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کا ھدیہ عقیدت:

خواجہ معین الدین چشتی اجمیری برصغیر پاک و ہند کے مشہور صوفی بزرگ ہیں ۔ ان کا مزار ہندوستان کے شہر اجمیر شریف میں ہے۔ مولا علی اور اہل بیت کی مدح میں ان کے اشعار بہت زیادہ ہے۔ ان کی یہ رباعی مشہور اور زباں زدعام ہے اور کہتے ہیں کہ یہ ان کے مزار کے کتبہ پر بھی لکھی ہوئی ہے:

شاہ است حسین بادشاہ است حسین	دین است حسین دین پناہ است حسین
سر داد نہ داد دست در دست یزید	حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

(نوائے صوفیہ صفحہ 128)

قارئین محترم! کیس آپ کی عدالت میں ہے۔صوفیاء کے ان اشعار کو دیکھ کر بھی اگر کوئی کہے کہ یہ صوفیاء وعرفاء دشمنان اہل بیت ہیں تو اگر وہ کوئی اور ہو تو اس کو تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن اگر وہ علامہ محمد حسین نجفی صاحب دام ظلہ ہوں تو انہیں کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا، اس لیے کہ ہم دل کی گہرائی سے ان کی عزت کرتے ہیں۔

تیسرا شبہ: شیعیان علی اور تصوف:

بعض شیعیان علی بھی تصوف کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ہم اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کئی شیعیان علی علیہ السلام کو دیکھتے ہیں کہ وہ تصوف کی طرف میلان اور جھکاؤ رکھتے ہیں۔ پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ دشمنان آل محمد کا مسلک ہے۔

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ اس شبہ کے جواب میں فرماتے ہیں: یہ درست ہے کہ بعض شیعیان علی کا جھکاؤ صوفیت اور صوفیہ کی طرف رہا ہے کیونکہ ان لوگوں کا دام ہمرنگ زمین ہی ایسا تھا کہ بعض محبان اہل بیت بھی اس میں گرفتار ہو گئے۔آگے چل کر لکھتے ہیں: مگر یہ بات ممکن ہے، ناممکن نہیں ہے، اور اس کا سبب جہالت و لاعلمی کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔آخر میں علامہ صاحب دام ظلہ نے حسب عادت ایک شعر بھی چست کر دیا:

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ ورسم شاہبازی

علامہ صاحب دام ظلہ کے اس بیان پر بھی سوائے اظہار تاسف کے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جواب صاف صاف آئیں بائیں شائیں کا مصداق ہے۔

علامہ نجفی دام ظلہ نے اپنی کتاب میں متعدد بار نے یہ کہا ہے کہ تصوف اور اسلام کا آپس میں اتنا بھی تعلق نہیں ہے جتنا کھجور کی گٹھلی کا اس کے چھلکے سے ہوتا ہے اور یہاں تصوف اور تشیع کی ہم رنگی کو لے کر بیٹھ گئے۔ تصوف کو شیعہ کے لیے دام ہمرنگ زمین کہہ رہے ہیں۔ گویا تشیع زمین ہے اور تصوف وہ جال ہے جو زمین کے رنگ کا ہے جس میں شیعہ جہالت اور غلط فہمی سے پھنس جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر واقعی تصوف اور اسلام کا آپس میں اتنا بھی تعلق نہیں ہے جتنا کھجور کی گٹھلی کا اس کے چھلکے سے ہوتا ہے تو پھر شیعہ کے لیے تصوف دام ہم رنگ زمین کیسے ہو گیا؟ آخر تصوف اور تشیع میں وہ کون سی ہم رنگی ہے جس کی وجہ سے ملا صدرا، علامہ طباطبائی، علامہ علی قاضی، امام خمینی، آیت اللہ بہجت، مرتضی مطہری، آیت اللہ جوادی آملی اور بہت سے دیگر قابل ذکر افراد جنہیں عالم تشیع میں بہت بلند علمی مقام حاصل ہے، اس دام ہم رنگ زمین میں گرفتار ہو گئے۔

جن شیعہ عرفاء کے نام ہم نے بیان کیے ہیں یہ کرگسوں میں پلے ہوئے فریب خوردہ شاہین ہیں؟ خدا کا خوف کریں! یہ قم، مشہد اور نجف کے حوزہ ہائے علمیہ کی گود میں پلے اور پروان چڑھے ہیں۔ یہ نہ صرف وہاں پڑھے ہیں بلکہ ان کا شمار ان علمی مراکز کے مایہ ناز اساتذہ میں ہوتا ہے۔ جن علوم وفنون میں علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کو دسترس حاصل ہے جس کی وجہ سے انہیں علامہ، آیت اللہ اور مرجع تقلید کہا جاتا ہے، ان سب علوم میں بھی ان افراد کو علامہ نجفی صاحب سے کہیں زیادہ کمال اور دسترس حاصل تھی۔ ان شخصیات کے بارے میں یہ کہنا کمال زیادتی اور بے انصافی ہے کہ یہ کرگسوں میں پلے ہوئے شاہین تھے جو راہ ورسم شاہبازی سے واقف نہیں تھے۔

بہر حال اس تیسرے شبہ کی ذیل میں علامہ صاحب کی گفتگو میں کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہ تضادات سے بھری گمراہ کن خیال بافی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

چوتھا شبہ: کشوف و کرامات:

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے شبہات کے ذیل میں اپنی کتاب کے صفحہ 79 پر کشف و کرامت پر بھی گفتگو کی ہے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ گفتگو بھی غیر علمی اور غیر عادلانہ ہے۔ ان کی یہ بات بالکل بجا ہے کہ پیران نمی پرند مریدان می پرانند۔ یعنی پیر خود نہیں اڑتے، ان کے مریدان کے اڑنے کی داستانیں مشہور کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ بات صرف تصوف اور صوفیہ تک محدود نہیں ہے۔ علماء و فقہاء و مجتہدین کے بارے میں بھی ایسی کہانیاں ان کے ارادت مندوں نے مشہور کر رکھی ہیں۔ ان میں سے ایک داستان شیخ مفیدؒ کے بارے میں مشہور ہے۔ داستان کچھ اس طرح سے ہے کہ ایک حاملہ عورت فوت ہو گئی جس کے پیٹ میں بچہ زندہ تھا۔ اس کے لواحقین شیخ مفید کے پاس آئے اور حکم شرعی دریافت کیا کہ آیا اس بچے کو مردہ ماں کے ساتھ دفن کر دیا جائے یا مردہ ماں کا پیٹ چاک کر کے بچے کو نکال لیا جائے۔ شیخ مفید نے کہا کہ ماں کو بچے سمیت دفن کر دیا جائے۔ جب وہ لوگ شیخ مفید کا یہ فتویٰ لے کر واپس پہنچے تو ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ شیخ کہہ رہے ہیں کہ مردہ ماں کا پیٹ چاک کر کے بچے کو نکال لو۔ بعد میں جب یہ بات شیخ مفید تک پہنچی تو وہ سمجھ گئے کہ میں نے غلط فتویٰ دے دیا تھا اور امام عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف نے اصلاح فرما دی۔ اس پر انہوں نے آئندہ کوئی بھی فتویٰ نہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ امام علیہ السلام کی طرف سے ان کے پاس پیغام آیا کہ تم فتویٰ دو جہاں غلطی کرو گے ہم اصلاح کر دیں گے۔

معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی جان سکتا ہے کہ اس داستان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ قرآن و اہل بیت کی تعلیمات سے معمولی سی واقفیت رکھنے والا شخص بھی کبھی ایسا جاہلانہ فتویٰ نہیں دے گا کہ مردہ ماں کے پیٹ میں بچہ زندہ ہو تو ماں کو زندہ بچے سمیت دفن کر دیا جائے کجا یہ کہ شیخ مفیدؒ جیسا فقیہ ایسی بات کرے۔ دوسری بات یہ کہ اگر ماں مر جائے اور اس کے پیٹ میں زندہ بچہ موجود ہو تو وہ بچہ صرف تین سے پانچ منٹ تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اس لیے کہ ماں کے پیٹ میں بچے کو آکسیجن ماں کے سانس لینے سے ملتی ہے۔ جب ماں مر جائے اور سانس لینا بند کر دے تو بچہ اتنی ہی دیر تک زندہ رہ سکتا ہے جب تک ماں کے جسم میں بچی کھچی آکسیجن موجود ہو جو طبی ماہرین کے مطابق بچے کو زیادہ سے زیادہ تین سے پانچ منٹ تک زندہ رکھ سکتی ہے۔

اس قسم کی کہانیاں ان لوگوں نے گھڑی ہیں جو عوام کے اندر اس بات کو راسخ کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے فقہاء کے سارے فتاویٰ بالکل صحیح اور امام عصر کی نگرانی میں ہوتے ہیں، اور اگر کوئی مجتہد غلطی کر جائے تو امام اس کی اصلاح کر دیتے ہیں اور اگر مجتہد کوئی فتویٰ دے اور امام اس کی اصلاح نہ کریں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ فتویٰ صحیح ہے۔

یقیناً صوفیہ کے ارادتمندوں نے بھی ایسی بہت سے کہانیاں گھڑ رکھی ہیں۔لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ خود صوفیہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اس بارے میں مندرجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔اشرف علی تھانوی اپنی کتاب جواہرات میں لکھتے ہیں:

کشف کوئی مطلوب شیء نہیں ھے:

''اور حدیث میں آیا ہے کہ قبر میں مردوں کو جو عذاب ہوتا ہے سوائے جن وانس کے سب کو اس کا ادراک ہوتا ہے۔حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک گھوڑے پر سوار تھے۔قبرستان میں گزر ہوا، گھوڑا بدکا، آپ نے فرمایا کہ مردوں کو عذاب ہو رہا ہے، گھوڑے کو اس کا انکشاف ہوا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کشف کوئی مطلوب شے نہیں ہے۔اس لیے کہ اس میں جانور بھی شریک ہیں، اور جانور تو جانور، شیطان کو بھی کشف ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن شریف میں غزوہ بدر کے قصہ میں آیا ہے کہ شیطان کفار کے ساتھ آیا، جب مسلمانوں کا لشکر نظر آیا تو پیچھے ہٹ گیا۔چنانچہ ارشاد ہے:

فَلَمَّا تَرَ اٰئَتِ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلٰی عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ

یعنی جس وقت کافروں اور مسلمانوں کی دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو

شیطان الٹے پاؤں ہٹا اور کہا کہ میں وہ شے دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔(انفال:48)

اس کی تفسیر میں آیا ہے کہ اس غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کے لیے پانچ ہزار فرشتے آئے تھے اور شیطان کو نظر آئے اس لیے وہ بھاگ گیا اور جو حضور کے ساتھ بڑے بڑے صحابہ تھے ان میں اکثر کو فرشتے نظر نہیں آئے۔معلوم ہوا کہ کشف کوئی کمال مقصود نہیں ہے۔عبادت اور مجاہدہ وریاضت سے کسی کو اگر یہ کشف ہی مطلوب ہو تو وہ غلطی پر ہے''۔ (جواہرات 3:281)

کرامت کی حقیقت:

’’کرامت اس امر کو کہتے ہیں جو کسی نبی کے کسی متبع کامل سے صادر ہو اور قانون عادت سے خارج ہو۔ پس اگر وہ امر خلاف عادت نہ ہو تو کرامت نہیں ہے۔ اور جس شخص سے وہ صادر ہوا ہے اگر وہ اپنے آپ کو کسی نبی کا متبع نہیں کہتا تو وہ بھی کرامت نہیں ہے۔ جیسے جوگیوں ساحروں وغیرہم سے ایسے امور سرزد ہو جاتے ہیں۔ اور اگر وہ شخص مدعی اتباع کا تو ہے مگر واقع میں متبع نہیں ہے خواہ اصول میں خلاف کرتا ہو جس طرح اہل بدعت یا فروع میں جیسے فاسق و فاجر، اس سے بھی اگر ایسا امر صادر ہو تو وہ کرامت نہیں ہے۔ پس کرامت اس وقت کہلائے گی جبکہ اس کا محل صدور مومن، متبع سنت، کامل التقویٰ ہو۔ اب ہمارے زمانہ میں جس شخص سے کوئی فعل عجیب سرزد ہو جاتا ہے اس کو غوث و قطب قرار دے دیتے ہیں خواہ اس شخص کے کیسے ہی عقائد ہوں اور کیسے ہی اعمال و اخلاق ہوں۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ بزرگوں نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کسی کو ہوا میں اڑتا دیکھو یا پانی پر چلتا دیکھو مگر وہ شریعت کا پابند نہ ہو تو اسے ہیچ سمجھو۔ (شریعت وتصوف: اشرف علی تھانوی 325)

صفحہ 48 پر آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ ابو محمد عبداللہ بن محمد مرتعش نے ارادت کے ضمن میں کہا:

’’ارادت یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنی تمام مرادوں سے اپنے نفس کو روک لے، اللہ کے احکام پر عمل کرے اور اللہ کے فیصلوں پر راضی رہے۔ کسی نے ان سے کہا کہ فلاں شخص پانی پر چلتا ہے تو آپ نے جواب دیا: میرے نزدیک اللہ تعالیٰ جسے نفسانی خواہشات کی مخالفت کی ہمت دیتا ہے وہ ہوا میں اڑ کر دکھانے والے سے بہتر ہوتا ہے‘‘۔

قارئین محترم! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کشف وکرامت کی تصوف میں کیا اہمیت ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی اپنا زور کلام اس بات پر صرف کر دے کہ صوفیاء کے ہاں کشف وکرامات کو بہت اہمیت حاصل ہے اور وہ اسی کے لیے جانکاہ مشقتیں برداشت کرتے ہیں تو ایسے شخص کی نادانی پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات بھی بالکل صحیح ہے کہ یہ کشف کسی بھی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے۔ دور جدید میں مائنڈ سائنس نے اسے اور بھی آسان بنا دیا ہے۔ مائنڈ سائنس کے مطابق کوئی بھی انسان کچھ خاص تکنیکوں کے استعمال

سے اپنے دماغ کو ایک مخصوص فریکوینسی میں لے جا کر اپنے دماغ کے ایک مخصوص حصے کو فعال (Activate) کر کے کشف حاصل کر سکتا ہے۔ مائنڈ سائنس کی اصطلاح میں اسے ریموٹ ویونگ (Romote Viewing) کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے ٹیلی کائی نیسز (Telekinesis) کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔ مائنڈ پاور ٹریننگ کے پروگراموں میں ٹریننگ کے اختتام پر ٹریننگ کے شرکاء سے ایک ٹیسٹ لیا جاتا ہے۔ اس ٹیسٹ میں طالب علم کو کسی شخص کا نام، عمر اور شہر کے نام بتائے جاتے ہیں، اور چند منٹ کے اندر اندر وہ طالب علم اس شخص کا سارا حلیہ بتا دیتا ہے۔ ہماری ٹریننگ میں آئے ہوئے ایک طالبعلم نے بتایا کہ بی ایس سی کے سالانہ امتحان میں ایک مضمون میں اس کی تیاری اچھی نہیں تھی تو اس نے مائنڈ پاور ٹریننگ میں سکھائی گئی ٹیکنیک کے استعمال سے امتحان میں آنے والے سوال کشف کر لیے۔ حالانکہ دروان تربیت انہیں سختی سے منع کیا جاتا ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کو ایسے غیر اخلاقی اور غیر قانونی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کریں گے۔

پانچواں شبہ: صوفیاء امن کے داعی:

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ اپنی کتاب کے صفحہ 81 پر تحریر فرماتے ہیں:

پانچواں شبہ: صوفیاء امن کے داعی ہیں اور انہوں نے برصغیر میں اسلام پھیلایا۔

جواب شبہ: اس شبہ کا جواب مہر نیمروز سے بھی زیادہ روشن ہے کہ اگر صوفیہ کا مشن امن و آشتی ہے اور رواداری ہے تو کیا اسلام تشدد اور جنگ وجدال اور قتل وقتال کا دین ہے؟

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کا یہ جواب جو بقول ان کے مہر نیمروز سے بھی زیادہ روشن ہے، بالکل بودا اور بے اساس ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے جواب میں تصوف کے مقابلے میں اسلام کو لے آئے۔ حالانکہ موازنہ اور مقابلہ اسلام اور تصوف کا نہیں بلکہ تصوف اور ملا ازم کا ہے۔ ایک طرف ملا کا اسلام ہے اور دوسری طرف عرفاء وصوفیاء کا اسلام ہے۔ اللہ کا بھیجا ہوا دین اسلام یقیناً صلح وصفا کا دین ہے لیکن ملا کا دین، جیسا کہ خود علامہ صاحب دام ظلہ نے اسی مبحث میں اقرار کیا ہے کہ تشدد اور فساد کے سوا کچھ نہیں ہے۔ انہوں نے علامہ اقبال کے اس مصرع کو بھی نقل کیا ہے کہ دین ملا فی سبیل اللہ فساد۔ لیکن شعر غلط نقل کیا ہے۔ شعر اس

طرح ہے:

دین کافر فکر و تدبیر و جہاد　　　دین ملا سبیل اللہ فساد

جب کہ علامہ صاحب نے یہ شعر اس طرح لکھا ہے:

دین مومن فکر و تدبیر جہاد　　　دین ملا فی سبیل اللہ فساد

یعنی اقبال ملا کا موازنہ مومن سے نہیں کافر سے کر رہے ہیں اور کافر کو ملا سے بہتر قرار دے رہے ہیں۔آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ملا کے فساد نے کس طرح ساری دنیا کو بالعموم، مسلم دنیا کو بالخصوص اور پاکستان کو بالاخص اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔

ملا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال کا یہ شعر بھی قابل توجہ ہے:

دین حق از کافری رسوا تر است　　　زانکہ ملا مومن کافر گر است

ترجمہ: دین حق یعنی اللہ کا دین کفر سے بھی زیادہ رسوا ہو چکا ہے، اس لیے کہ ملا ایسا مومن ہے جو کافروں کو مسلمان بنانے کی بجائے مسلمانوں کو کافر بنانے پر لگا ہوا ہے۔ (جاوید نامہ: سعید حلیم پاشا)

شطحیات و کرامات کے بارے میں مؤلف کی لاعلمی:

صفحہ 86 پر علامہ نجفی دام ظلہ نے آٹھواں باب باندھا ہے اور اس کا عنوان ہے:

''صوفیہ کے بعض کشوف و کرامات یا بالفاظ مناسب شطحیات کا تذکرہ۔''

اس موضوع کے ذیل میں بھی علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے انتہائی عامیانہ سطح کی گفتگو کی ہے جو ان کے اس علمی قد کاٹھ کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی جو احسن الفوائد اور تجلیات صداقت وغیرہ میں نظر آتا ہے بلکہ اس سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ موصوف شطحیات و کرامات کے معنی تک سے واقف نہیں ہیں۔موصوف نے اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح فرمایا ہے:

''عصمت مآب ذوات مقدسہ کو چھوڑ کر باقی ہر انسان خواہ خاص ہو یا عام، عالم ہو یا جاہل، نیکوکار ہو یا بدکار، فطرۃً اعجوبہ پسند واقع ہوا ہے۔اگر اسے معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص عجیب وغریب کرامات دکھا رہا ہے تو وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے اگرچہ وہ شخص ننگ دھڑنگ اور مجذوب قسم کا ہی کیوں نہ

ہواور شعبدہ بازہی کیوں نہ ہو۔ بہر کیف اس شعبدہ بازی کا نام (عوام کالانعام کی نگاہ میں) کرامت ہی رکھا جائے گا۔۔۔حقیقت الامر یہ ہے کہ تصوف کا سارادارومدار ہی انسان کی اس اعجوبہ پسندی پر ہے''۔

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کی اس تحریر سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کرامات کے بارے میں علامہ صاحب کا مبلغ علم کیا ہے۔عدل وانصاف اور تحقیق وتدقیق کا تقاضا تو یہ ہے کہ پہلے کرامت کے معنی واضح کیے جاتے، پھر اللہ تعالیٰ کے حقیقی اولیاء کی کرامت پر روشنی ڈالی جاتی ،اس کے بعد صوفیہ کی کرامات (جنہیں علامہ صاحب اوران کے ہم مشرب افراد شعبدہ بازی کہتے ہیں) کے ساتھ ان کا تقابل کر کے حقیقت کو واضح کیا جاتا۔لیکن ان علمی نکات کی تو کوئی خبر ہی نہیں لی گئی۔

ہم اس موضوع پر زیادہ بات نہیں کریں گے۔اس لیے کہ پہلے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ خود صوفیاء کے ہاں کشوف وکرامات کی کوئی اہمیت نہیں ہے اوراس بات پر زور بیان صرف کرنا زیادتی اور خلاف عدالت ہے کہ صوفیاء کے ہاں یہی سب سے بڑی چیز ہے۔یہاں چند اہم نکات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا ضروری ہے۔علامہ صاحب نے اپنی گفتگو کا آغاز ان الفاظ سے کیا:

''عصمت مآب ذوات مقدسہ کو چھوڑ کر باقی ہر انسان خواہ خاص ہو یا عام، عالم ہو یا جاہل، نیکوکار ہو یا بدکار،فطرۃً اعجوبہ پسند واقع ہوا ہے۔اگر اسے معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص عجیب وغریب کرامات دکھا رہا ہے تو وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔'' اس جملے میں علامہ صاحب ایک بہت بڑی حقیقت کا اعتراف کر گئے ہیں اور وہ یہ کہ انسان فطری طور پر اعجوبہ پسند واقع ہوا ہے۔فلسفہ وکلام میں اللہ کے وجود کے دلائل میں سے ایک دلیل انسانی فطرت کو قرار دیا گیا ہے۔استدلال کی ساری قوت اس نکتے پر ہے کہ فطرت حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور چونکہ ہر انسان فطری طور پر ایک برتر ہستی پر ایمان رکھتا ہے اوراس کی پرستش کرتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حقیقت میں کوئی ایسی ہستی ضرور موجود ہے جو حقیقی معنوں میں برتر ہستی اور حقیقی معبود ہے۔جس طرح پیاس اس بات کی دلیل ہے کہ پانی موجود ہے، اسی طرح ہر انسان کے اندر کسی خدا کی پرستش کرنے کا جذبہ موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی حقیقی خدا اور معبود موجود ہے۔

اب اسی استدلال کو یہاں پر لے آتے ہیں۔اگر انسان فطری طور پر اعجوبہ پسند واقع ہوا ہے تو

اس کے معنی یہ ہیں کہ حقیقت کی دنیا میں ایسے عجائبات موجود ہیں۔ ورنہ فطرت جھوٹی ثابت ہوگی اور علم کلام میں، جس میں خود علامہ نجفی صاحب بھی ماشاء اللہ بہت اچھی دسترس رکھتے ہیں یہ ثابت ہے کہ فطرت جھوٹی نہیں ہوتی۔

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے جن کرامات (بقول خود ان کے شعبدہ بازیوں) کا ذکر کیا ہے، یہ جزئیات ہیں۔ کسی بات کو کلی طور پر درست تسلیم کر لینے کے باوجود ضروری نہیں کہ اس کے بارے میں منقول سب جزئیات کو بھی درست مان لیا جائے۔ لیکن علامہ صاحب کی نقل کردہ ان کرامات میں سے بعض ایسی بھی ہیں کہ جن پر حیرت واستعجاب کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ ان میں ایک یہ ہے:

''ایک مجلس میں الحمد شریف کے فضائل بیان کرتے ہوئے (خواجہ معین الدین اجمیری نے) فرمایا کہ میں اور خواجہ عثمان ہارونی سفر میں تھے، دجلہ کے کنارے پہنچے، دریا طغیانی پر تھا، میں فکر میں ہوا کہ کس طرح اتریں اور جلد عبور کرنے کے ضرورت تھی۔ حضرت خواجہ نے فرمایا کہ آنکھیں بند کرو، میں نے آنکھیں بند کیں، تھوڑی دیر میں کھولیں اور خود کو اور حضرت خواجہ کو پار پایا۔ میں نے دریافت کیا کہ کس طرح عبور فرمایا؟ ارشاد ہوا کہ الحمد شریف کو پانچ مرتبہ پڑھ کر پانی پر قدم رکھا اور پار اتر گئے''۔

ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ علامہ صاحب کی نظر میں یہ کرامت کیوں ناممکن ہے۔ یہ واقعہ درست ہوسکتا ہے۔ اگر درست ہو تو کسی شخص کی کرامت سے زیادہ یہ سورت الحمد کا اعجاز ہے۔ کیا آئمہ معصومین علیہم السلام کی احادیث میں یہ بات موجود نہیں ہے کہ اگر ستر مرتبہ سورت فاتحہ پڑھ کر کسی مردے پر دم کی جائے اور وہ مردہ زندہ ہو جائے تو تعجب نہ کرنا۔ (بحار الانوار 257:89)

کیا قرآن مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک ساتھی آصف بن برخیا کا واقعہ موجود نہیں ہے کہ وہ پلک جھپکنے میں بلقیس کا تخت سبا سے فلسطین لے آئے تھے۔ تفسیر قمی اور بعض دیگر تفاسیر میں اس واقعہ کے ذیل میں روایات میں ہے کہ انہوں نے اسم اعظم کی برکت سے ایسا کیا تھا۔ اگر اللہ کے کسی ولی کے پاس اسم اعظم کا علم ہو اور وہ اس سے کوئی کام لے تو اس میں تعجب اور اچنبھے کی کیا بات ہے؟

ہم نے کتاب کے آغاز میں اہل حدیث عالم احسان الٰہی ظہیر کی کتاب کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے بھی اپنی کتاب میں آئمہ معصومین علیہم السلام کے معجزات کا انکار بالکل اسی لب ولہجہ میں کیا ہے جو علامہ

نجفی صاحب دام ظلہ نے اپنایا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے کشوف و کرامات کو شطحیات کہا ہے ہیں حالانکہ شطحیات بالکل الگ چیز ہے۔ اگر عربی یا فارسی کی کسی بھی لغت کو کھول کر دیکھیں تو شطحیات کے معنی یہ لکھے ہوئے ہیں: ''ہر وہ کلام جس کا ظاہر خلاف شریعت ہو''۔ صوفیاء کے کلمات اور ان کے اشعار میں بعض ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جو ان لوگوں کو خلاف شریعت معلوم ہوتی ہیں جو دین کا سطحی علم رکھتے ہیں اور صوفیاء کی زبان اور اصطلاحات سے واقف نہیں ہوتے۔

اب یہاں سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ صوفیاء کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ ایسی باتیں کریں جو بظاہر خلاف شریعت ہوں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ صوفیاء کی گفتگو اللہ، روح، انسان اور اللہ کے روحانی تعلق اور اس روحانی تعلق کے لحاظ سے انسان کی مختلف کیفیات کے بارے میں ہوتی ہے۔ ان سب امور کا تعلق عالم غیب سے ہے۔ لیکن ان کے لیے الفاظ وہی استعمال کرنے پڑتے ہیں جو انسانوں نے اپنی عام ضرورت کے لیے وضع کیے ہیں۔ ایسے میں لامحالہ دامن الفاظ کی کوتاہی آڑے آتی ہے۔ قرآن مجید میں بھی اس قسم کے استعمال ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر: **یداہ مبسوطتان** (اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں) **جاء ربک** (تیرا رب آ گیا) **الرحمن علی العرش استوی** (رحمن عرش پر مستوی ہوا) **یحمل عرش ربک فوقھم یومئذ ثمانیہ** (اس دن تیرے رب کے عرش کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے) **و کان عرشہ علی الماء** (اور اللہ کا عرش پانی پر تھا)

اب اگر ان آیات سے کوئی ثابت کرنا چاہے کہ اللہ تعالیٰ جسم رکھتا ہے، اس کے دو ہاتھ ہیں، وہ عرش پر بیٹھا ہوا ہے، اس کے عرش کو آٹھ فرشتوں نے اٹھایا ہوا ہے۔ وہ چلتا پھرتا ہے، آتا جاتا ہے تو کیا اس کی بات صحیح ہوگی؟ یقیناً نہیں۔ ایسے شخص کو علمائے اسلام بشمول علامہ نجفی صاحب دام ظلہ یہی سمجھائیں گے کہ یہ آیات آیات متشابہات ہیں اور ان کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں (یعنی ان کے ظاہری معنی خلاف شریعت ہیں)۔ بالکل اسی طرح عالم غیب کے حقائق کے بارے میں اور اپنے روحانی محسوسات کے بارے میں صوفیاء کے کلمات اور اشعار میں ایسی چیزیں موجود ہیں۔ انہیں کو شطحیات کہا جاتا ہے۔ خود صوفیاء نے بھی کئی مقامات پر اپنے اس عجز بیان اور کوتاہی زبان کا اقرار کیا ہے۔ مثلاً:

من گنگ خواب دیدہ و عالم تمام کر	من عاجزم زگفتن وخلق از شنیدنش

ترجمہ: میں ایک گونگا ہوں جس نے ایک خواب دیکھا ہے اور باقی سب لوگ بہرے ہیں،

میں بیان کرنے سے عاجز ہوں اور لوگ سننے سے قاصر ہیں۔

یا ایک جگہ اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کرنے کے بعد رومی اپنے عجز و ناتوانی کا اقرار اس طرح کرتے ہیں:

ای برون از وہم قال و قیل من	خاک برفرق من و تمثیل من

ترجمہ: اے خدا! اے وہ جو میرے وہم و گمان اور قال و قیل کے احاطے سے باہر ہے،

خاک میرے سر پر اور خاک میری اس تمثیل پر جو میں نے بیان کی ہے۔

جو کچھ ایک حقیقی صوفی اور عارف مشاہدہ روحانی کے مقام سے دیکھتا ہے جب وہ اسے بیان کرنے لگتا ہے تو اس کے پاس لغت میں ایسے الفاظ نہیں ہوتے جن کے استعمال سے وہ اپنا مافی الضمیر پوری طرح سے بیان کر سکے۔ اپنی اس مجبوری کو سمجھانے کے لیے صوفیاء و عرفاء یہ مثال دیا کرتے ہیں کہ اگر آپ کسی پیدائشی اندھے کو بتانا چاہیں کہ سبز رنگ کیسا ہوتا ہے تو کیسے بتائیں گے؟ آپ جو بھی انداز اختیار کریں گے پیدائشی اندھے کو سبز یا کوئی بھی رنگ سمجھانا ناممکن ہوتا ہے۔ یہی حال روحانی مشاہدات بیان کرنے کا ہے۔

شطحیات کے ضمن میں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ صوفیاء و عرفاء کی کتب اور تحریروں میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے کہ شطحیات عام طور پر اس وقت کسی صوفی یا عارف کی زبان سے صادر ہوتے ہیں جب وہ جذب و بے خودی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اس حالت پر ان کا مواخذہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ اختیاری حالت نہیں ہوتی، لیکن شطحیات کی پیروی بھی نہیں جا سکتی۔
علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے کشف و کرامات کو شطحیات کہہ کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ تصوف کی زبان و اصطلاحات سے واقفیت نہیں رکھتے۔

قوت ارادی کا کرشمہ؟

کشوف و کرامات پر تنقید کرتے ہوئے صفحہ 98 پر علامہ نجفی صاحب نے اس سوال پر بھی گفتگو

فرمائی ہے کہ ان چیزوں (یعنی بقول علامہ نجفی صاحب دام ظلہ صوفیاء وعرفاء کی شعبدہ بازیوں) کا اثر کیونکر ظاہر ہوتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: ''یہ سب کچھ قوت ارادی کے ارتکاز کا ثمرہ ہے اور نتیجہ ہے اور وہ ایک فنی چیز ہے۔ جو مخصوص ریاضتوں، چلہ کشی، مراقبوں اور مخصوص مہارتوں سے ہر شخص بلا تفریق مذہب ومسلک حاصل کرسکتا ہے اور فوق العادۃ (یعنی غیر معمولی) کام کر کے دکھا سکتا ہے''۔

اس مسئلہ پر بات کو آگے بڑھانے سے پہلے قارئین محترم کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ انسان تین چیزوں سے مرکب ہے۔ جسم، ذہن اور روح۔ ان تینوں میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے خاص قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ مشق وریاضت کے ذریعے ان قوتوں کو زیادہ سے زیادہ فعال کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً میرے جیسا یا علامہ نجفی صاحب جیسا شخص پانچ کلوگرام وزن کی کوئی چیز اٹھا کر گراؤنڈ فلور سے پہلی منزل تک لے جائے تو تھک جاتا ہے۔ لیکن غلہ منڈی میں کام کرنے والے مزدور بہت آسانی سے سوسو کلوگرام (یعنی اڑھائی من) وزنی بوریاں اپنی کمر پر لادکر ٹرکوں پر اتار چڑھا رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح وزن برداری کے عالمی مقابلوں میں بعض اوقات بعض وزن بردار پانچ سو کلوگرام (یعنی ساڑھے بارہ من) وزن اپنے بازوؤں اور کلائیوں کے زور پر اٹھا لیتے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ ایسا کر کے وہ کوئی معجزہ یا کرامت نہیں کررہے ہوتے۔ مسلسل مشق وریاضت سے انہوں نے اپنی پوشیدہ جسمانی قوت کو فعال کرلیا ہوتا ہے۔ کوئی بھی ایسا کرسکتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو حیرت انگیز ذہنی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، مشق وریاضت سے ان میں بھی حیرت انگیز کام لیے جاسکتے ہیں۔ علامہ نجفی صاحب دام ظلہ غلہ منڈی میں کام کرنے والے مزدور اور پہلوانوں کی جسمانی طاقت کے معترف ہیں اور قوت ارادی کے ارتکاز سے غیر معمولی کام کرنے کی صلاحیت کا بھی اعتراف کرتے ہیں لیکن روح کی طاقت کا اعتراف کرنے سے کیوں گھبراتے ہیں، جو ذہن اور جسم کی طاقت سے کہیں زیادہ ہے؟ جس طرح جسمانی مشق وریاضت سے جسمانی قوت میں اضافہ ہوسکتا ہے اور ذہنی ودماغی مشق وریاضت سے ذہنی صلاحیتوں اور ذہنی قوت وطاقت میں حیرت انگیز اضافہ ہوسکتا ہے تو روحانی لحاظ سے مضبوط، اللہ کا کوئی بندہ، روحانی طاقت سے غیر معمولی کام کیوں نہیں کرسکتا؟ کیا علامہ نجفی صاحب روح اور روح کی طاقت کے منکر ہیں؟

ایک دلچسپ واقعہ:

یہ کوئی فرضی حکایت نہیں ہے بلکہ ان دنوں کا سچا واقعہ ہے جب ہم میٹرک میں پڑھتے تھے۔ ہمارے محلے میں ایک شاہ صاحب رہتے تھے جو عامل تھے۔ ہر اتوار کو تعویذ لینے کے لیے بہت سے مرد و زن ان کی بیٹھک پر آتے تھے۔ ایک بار ہم چند دوست ان کے پاس بیٹھے تھے اور وہ عاملوں اور عملیات کے واقعات سنا رہے تھے۔ ان کی حیرت انگیز باتوں کو سن کر ہمارے ایک دوست نے کہا: چاچا جی اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ ولی ہیں۔ (اس زمانے میں انکل کا لفظ استعمال کرنے کا رواج نہیں تھا)۔ چاچا جی نے جواب دیا: نہیں بیٹا، ہم ولی نہیں ہیں، ہم عامل ہیں، عامل عمل کرتا ہے، اس کا عمل کبھی نشانے پر لگتا ہے کبھی نہیں لگتا۔ ولی عامل نہیں ہوتا، وہ کوئی عمل نہیں کرتا بلکہ چیزوں کو حکم دیتا ہے اور اللہ کے حکم سے وہ ہو جاتی ہیں۔ اس پر ہمارے اسی دوست نے قریب ہی موجود مٹی کے ایک بڑے سے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے کہا: چاچا جی! اگر ولی مٹی کے اس ڈھیر کو حکم دے کہ سونا بن جاؤ تو یہ سونا بن جائے گی؟ چاچا جی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا: اس دا پیو وی بنڑسی (یعنی اس کا باپ بھی بنے گا)۔ ہمارے دوست نے پھر سوال کیا: چاچا جی! پھر وہ ایسا کرتے کیوں نہیں؟ چاچا جی نے جواب دیا: بیٹا! ولایت کی منزل پر پہنچنے سے بہت پہلے ہی سونا اور مٹی ان کی نظر میں برابر ہو چکے ہوتے ہیں۔

تعویذ گنڈے:

صفحہ 96 پر علامہ نجفی دام ظلہ نے نواں باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے: صوفیہ کے بعض تعویذات اور گنڈوں کا تذکرہ۔ یہ بھی علامہ صاحب کی لاعلمی اور زیادتی کا ایک نمونہ ہے۔ عاملین کے تعویذات اور گنڈوں کو صوفیاء کے تعویذت اور گنڈے کہنا سراسر زیادتی اور واضح طور پر خلاف عدالت ہے۔ مزید برآں کیا مولوی صاحبان ایسے ہی تعویذ اور گنڈے نہیں کرتے؟ اگر ان تعویذات کی وجہ سے کسی کو مطعون کیا جا سکتا ہے تو اس میں مولوی صاحبان بھی آتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سارا ملبہ صرف صوفیاء پر ڈالا جائے جب کہ تصوف کی بنیادی اور اصل کتب میں اس قسم کے عملیات کا کوئی تذکرہ تک نہیں ملتا۔ شیخ بہائی شیعہ علماء وفقہاء میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب سر المستتر تعویذات وعملیات کی مشہور

اور مستند کتاب ہے۔ کیا علامہ نجفی دام ظلہ شیخ بہائی کو بھی اسی طرح مطعون کریں گے جس طرح انہوں نے صوفیاء کو کیا ہے؟

مؤلف کی فقہی غلطی:

علامہ نجفی دام ظلہ صفحہ 97 پر تحریر فرماتے ہیں: ''ہاں البتہ مذہب شیعہ خیر البریہ کی اسلامی تعلیمات کے مطابق اگر کوئی عمل کرنا ہو یا کسی سورت یا آیت کو کسی خاص مقصد کے لیے مخصوص مقدار یا مخصوص کیفیت کے ساتھ پڑھنا ہو تو اس کے لیے سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام کی اجازت درکار ہے۔''

علامہ صاحب دام ظلہ کی یہ بات درست نہیں ہے۔ یہ مذہب شیعہ خیر البریہ کا نہیں بلکہ وہابیت کا نظریہ ہے۔ کسی ذکر کو، کسی آیت کو کسی مقصد کے لیے آپ جتنی بھی تعداد میں اور جس بھی کیفیت میں پڑھنا چاہیں پڑھ سکتے ہیں، اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ بشرطیکہ آپ اس عمل کو رسول اللہ یا آئمہ معصومین علیہم السلام کی طرف منسوب نہ کریں۔ مثال کے طور پر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کے حصول کے لیے ہر روز ایک بار، دس بار، بیس بار، چالیس بار یا سو بار یا ہزار بار سورۂ مومنون کی آخری آیت (رَبِّ اغْفِرْ وَ ارْحَمْ وَ اَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْن) پڑھنا چاہے تو اسے کسی قسم کی اجازت درکار نہیں ہے۔ وہ بالکل کر سکتا ہے، لیکن یہ نہ کہے کہ ایسا کرنے کا وجوبی یا استحبابی حکم فلاں امام نے دیا ہے۔ یہ نسبت جھوٹی ہو جائے گی اور امام معصوم کی طرف ایسی بات کی نسبت ہو جائے گی جو انہوں نے نہیں فرمائی۔

اس کے بعد علامہ صاحب دام ظلہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت صادق آل محمد کا ارشاد ہے:

کلما لم یخرج من ھذا البیت فھو زخرف

''تمہیں جو کچھ ہمارے گھر سے ملے اسے حق سمجھ کر لے لو اور جو کچھ
ہمارے گھر سے برآمد نہ ہوا سے باطل سمجھ کر چھوڑ دو''۔ (اصول کافی)

علامہ نجفی دام ظلہ نے اصول کافی کا نام تو بریکٹ میں لکھ دیا لیکن جلد، باب اور صفحہ ندارد۔ ہم نے یہ حدیث اصول کافی میں تلاش کرنے کی کوشش کی مگر نہیں ملی۔ کمپیوٹر کے ذریعے کئی بار پوری کافی (اصول و فروع و روضہ) دیکھ ڈالی مگر یہ روایت کافی میں کہیں نہیں ملی۔ اب اسے علامہ صاحب کی علمی ذمہ داری، علمی

غیر ذمہ داری کا نام دیا جائے یا کچھ اور نام دیا جائے اس کا فیصلہ ہم مومنین پر چھوڑ دیتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے نمونہ کے طور پر کچھ تعویذات و عملیات نقل کیے ہیں جن کا تصوف اور صوفیاء سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ اگر نام نہاد جعلی صوفیاء و عاملین کے ہاں اس قسم کے عملیات پائے جاتے ہوں تو حقیقی عرفان و تصوف سے ان چیزوں کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ یہ چیزیں تصوف کی کسی بنیادی کتاب میں ملتی ہیں۔

باقی رہ گیا قرآنی عملیات کا معاملہ، تو جس طرح مادی دنیا اپنی تمام تر محدودیت کے باوجود ایک وسیع و عریض دنیا ہے، مختلف ماہرین نے اپنے علم اور تجربے کی بنیاد پر بہت سی چیزوں کے، بہت سی جڑی بوٹیوں کے، بہت سے دھاتوں کے، بہت سے پتھروں کے بہت سے آثار و خواص معلوم کیے ہیں اور لوگ ان کی ان دریافتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کی وسیع و عریض دنیا میں سے اگر کچھ لوگوں نے اپنے علم اور تجربے سے بعض آیات کے کچھ آثار و خواص کو معلوم کر لیا ہو اور ان سے استفادہ و افادہ کر رہے ہوں تو اس میں تعجب اور اچنبھے کی یا سیخ پا ہونے کی کیا بات ہے؟

یہ بات بالکل بجا ہے کہ بنیادی طور پر قرآن مجید کتاب ہدایت ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرے، عقائد و اخلاق و احکام اسلامی کا علم قرآن شریف کی روشنی میں حاصل کرے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے حتیٰ کہ علماء نے بھی، اس سے ہدایت لینے کا کام ترک کر رکھا ہے۔ علماء نے عوام کو اپنی اندھی تقلید پر لگا رکھا ہے اور خود گزشتہ علماء کی اندھی تقلید پر لگے ہوئے ہیں۔ قرآن مجید صرف قسم کھانے، استخارہ اور فال دیکھنے اور دعاؤں اور تعویذات تک محدود کر دیا گیا ہے۔ یہ صرف ایک انتہائی نامناسب عمل ہی نہیں بلکہ قرآن پر ظلم ہے۔ لیکن اگر اس سے ہدایت لینے کے ساتھ ساتھ یہ ضمنی اور ذیلی فوائد بھی حاصل کر لیے جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور نہ ہی شریعت کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟

اصطلاحات تصوف:

صفحہ 110 پر علامہ صاحب دام ظلہ نے منازل و مقامات کے عنوان کے تحت تصوف و عرفان کی کچھ اصطلاحات کا ذکر کیا ہے مثلاً ارادہ، مشق و ریاضت، رقت، حال و مقام، قبض و بسط، جمع و فرق، غیب و حضور، ذوق، محو و صحو، خواطر، قلب، روح اور سر وغیرہ۔ اس کے بعد علماء اعلام اور مراجع تقلید سے استدعا کی گئی

ہے کہ خدا کو حاضر ناظر جان کر اور صادقین کی صداقت کا دامن تھام کر اور کاذبین سے اعلان برائت کر کے بتائیں کہ سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام کے علوم میں ان اصطلاحات کا یا اس گروہ کی خود ساختہ عبادتوں جیسے ذکر خفی و جلی یا مراقبہ یا ان لوگوں کی شریعت، طریقت اور حقیقت یا ان کے ملحدانہ عقیدہ وحدت الوجود یا وحدت الموجود اور شہود کا کوئی نام ونشان بھی ملتا ہے ۔بس اگر کوئی اس کا مدعی ہے تو اس کا قرآن وسنت کے نصوص صحیحہ وصریحہ سے ثبوت پیش کرے اور ہم سے منہ مانگا انعام حاصل کرے۔ پھر آگے چل کر ھل فیکم رجل رشید اور کس بمید ان درنمی آید سواراں راچہ شد(کوئی شہ سوار میرے مقابلے میں نہیں آ رہا، سواروں کو کیا ہو گیا ہے؟) جیسی رجز خوانی کی ہے۔

ایک طرف سے علم و تحقیق کے دعوے اور دوسری طرف سے ایسی غیر عالمانہ باتیں اور متکبرانہ رجز خوانی ؟ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔تصوف وعرفان کی اصطلاحات پر تو آپ علماء ومجتہدین ومراجع کو خدا و رسول اور آئمہ معصومین کے واسطے دے کر دہائی دے رہے ہیں کہ یہ اصطلاحات قرآن مجید اور محمد وآل محمد کی تعلیمات میں کہاں ہیں۔لیکن کیا آپ علم فقہ، علم اصول، علم حدیث، علم رجال اور علم کلام کی اصطلاحات قرآن وسنت کے نصوص صحیحہ وصریحہ میں دکھا سکتے ہیں؟علم اصول کی چند اصطلاحات کو لے لیتے ہیں: واجب تعبدی، واجب توصلی، امر تاسیسی و امر تاکیدی، امر مولوی و امر ارشادی ،فور وتراخی، استصحاب، برائت، اشتغال، اقل واکثر ارتباطی، اقل واکثر استقلالی، شبہ محصورہ، شبہ غیر محصورہ ،اصالتہ الاطلاق، اصالتہ العموم، اصالتہ الحقیقہ ،اصالتہ المجاز اور ایسی بہت سی دیگر اصطلاحات۔قارئین محترم کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ علم اصول کو علوم اسلامی میں ایک اہم مقام حاصل ہے، سب مجتہدین اور مراجع تقلید کی زندگی کا بڑا حصہ علم اصول پڑھنے اور پڑھانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ جو مجتہد علم اصول کا جتنا ماہر سمجھا جاتا ہے اتنا بڑا مجتہد سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف سے ایک تلخ حقیقت یہ ہے کہ آج تک علم اصول کے ماہر مجتہدین و مراجع علم اصول کی کسی ایک تعریف پر متفق نہیں ہو سکے۔کسی علم کی تعریف کا مقصد یہ واضح کرنا ہوتا ہے کہ اس علم میں کیا پڑھا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا علم ہے کہ ساری زندگی اس کے پڑھنے پڑھانے والے عظیم مراجع ومجتہدین اس علم کی تعریف پر متفق نہیں ہو سکے۔ بالفاظ دیگر ساری ساری زندگی اس علم پر صرف کر دینے کے

باوجود اس بات پر متفق نہیں ہو سکے کہ وہ کیا پڑھا رہے ہیں اور کیا پڑھ رہے ہیں۔

اب علم حدیث کی کچھ اصطلاحات کو لے لیں: متواتر، مستفیض، خبر واحد، صحیحہ، حسنہ، موثقہ، مرسل، مقطوع، مرفوع، مقبول، مردود، صحیح لذاتہ، حسن لذاتہ، صحیح لغیرہ، حسن لغیرہ، متصل، موصول، معنعن، موئنن وغیرہ۔ کیا یہ اصطلاحات قرآن وسنت کے نصوص صحیحہ وصریحہ میں دکھائی جا سکتی ہیں؟

دور کیوں جائیں، نزدیک سے ہی فیصلہ ہو جائے۔ کسی بھی شیعہ بچے کو جب دینیات کی تعلیم دی جاتی ہے تو پہلا سبق یہ پڑھایا جاتا ہے۔ اصول دین پانچ ہیں۔ فروع دین دس ہیں۔ صفات ثبوتیہ آٹھ ہیں۔ صفات سلبیہ آٹھ ہیں۔ دینیات کی ہر کتاب کا آغاز انہی باتوں سے ہوتا ہے۔ دین اسلام کے سب سے پہلے معلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ آپ کی حیات مبارکہ کے آخری ایام میں دین کی تکمیل ہو گئی اور ان کے بعد آئمہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین دین اسلام کے حقیقی معلم تھے۔ کسی امام کے فرمان میں دکھا دیں کہ انہوں نے اپنے کسی شیعہ کو اس طرح سے تعلیم دی ہو یا اپنے کسی شیعہ سے کہا ہو کہ اپنے بچوں کو اس طرح دین کی تعلیم دیا کرو کہ اصول دین پانچ ہیں: توحید، عدل، نبوت، امامت، قیامت۔ اصول دین دس ہیں: نماز، روزہ، حج، زکات، خمس جہاد، امر بالمعروف، نہی از منکر، تولا، تبرا۔ صفات ثبوتیہ آٹھ ہیں:۔۔۔۔۔صفات سلبیہ آٹھ ہیں:۔۔۔ یہ بیانات کسی امام معصوم کی احادیث میں نہیں ملیں گے۔ یہ علمائے علم کلام کا اپنا اختراع کردہ انداز اور ان کی اپنی اصطلاحیں ہیں۔ آئمہ معصومین علیہم السلام کا انداز ملاحظہ فرمائیں۔ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

بنی الاسلام علی الخمس: علی الصلوٰۃ و الصوم و الزکاۃ

و الحج و الولایہ و لم یناد بشئی بمثل ما نودی للولایہ

ترجمہ: اسلام کی عمارت پانچ بنیادوں پر تعمیر کی گئی ہے: نماز، روزہ، زکات، حج اور ولایت۔ اور جس طرح ولایت کی طرف بلایا گیا ہے کسی اور چیز کی طرف اس طرح نہیں بلایا گیا۔

(اصول کافی جلد 2، باب دعائم الاسلام حدیث 1)

اس حدیث کے مطابق نماز، روزہ، حج اوزکات دین کی بنیادیں ہیں۔ اگر دین کو عمارت سے

تشبیہ دی جائے تو بنیادیں ہیں اور اگر درخت سے تشبیہ دی جائے تو یہ دین کی جڑیں یعنی اصول دین ہیں۔ آئمہ معصومین علیہم السلام کے انداز تعلیم اور متکلمین کے انداز تعلیم کو دیکھ کر بندہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ببین تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا۔ کہ جن چیزوں کو متکلمین وفقہاء نے فروع دین میں ڈالا ہوا ہے وہ معصومین کی تعلیمات میں اصول دین میں نظر آرہی ہیں۔

جہاں تک عرفان وتصوف کی اصطلاحات کا تعلق ہے تو اصل بات یہ ہے کہ ہر علم آغاز میں بہت سادہ ہوا کرتا ہے۔ اس میں یا تو اصطلاحات بالکل نہیں ہوتی ہیں یا بہت کم اور سادہ ہوتی ہیں۔ جیسے جیسے اس میں ترقی آتی جاتی ہے اس میں نئی نئی اصطلاحات کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس وقت دنیا میں موجود تمام علوم کو دیکھ لیجیے خواہ وہ سائنسی علوم ہوں، معاشرتی علوم ہوں، فلسفہ ہو، یا کوئی اور علم۔ سو سال پہلے اس علم میں کون کون سی اصطلاحات رائج تھیں اور آج کون کون سی اصطلاحات رائج ہیں؟ آپ کو ہر علم میں آج وہ اصطلاحات ملیں گی جن کا سو سال پہلے کوئی نام ونشان تک نہیں تھا۔ نئی اصطلاحات کا وجود علم کے ارتقائی سفر کا لازمہ ہے۔ علم فقہ، علم حدیث، علم اصول، علم کلام، علم تفسیر میں بھی یہ چیز واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ پھر علم تصوف وعرفان کو اس سے کیوں مستثنیٰ سمجھا جائے؟

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے عرفان کی جن اصطلاحات کا ذکر کیا ہے ہم یہاں ان میں بعض اصطلاحات کا ثبوت فراہم کر دیتے ہیں تاکہ قارئین محترم کو حقیقت کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آجائے۔ ان سب اصطلاحات کی تفصیل جاننے کے خواہشمند خواتین وحضرات عرفان وتصوف کی کتب جیسے رسالہ قشیریہ، منازل السائرین یہ اور کشف المحجوب کی طرف رجوع فرمائیں۔

سب سے پہلے جس اصطلاح کا ذکر ہوا ہے وہ ہے ارادہ۔ ارادہ عربی زبان کا لفظ ہے جو اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہیں چاہنا، خواہش کرنا۔ یہ مصدر ہے اور عربی میں اس کا فعل ماضی اراد (یعنی اس نے ارادہ کیا) اور فعل مضارع یرید (یعنی وہ ارادہ کرتا ہے) ہے۔ ارادہ کرنے والے کو مرید کہتے ہیں۔ علم کلام کی اصطلاح میں یہ اللہ تعالیٰ کی صفات ثبوتیہ میں سے ایک ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر کام ارادے سے کرتا ہے۔

انسان اپنی زندگی میں جو بھی کام کرتا ہے اس کی بنیاد ارادہ ہوتا ہے۔ علامہ نجفی صاحب نے عالم

دین ہیں۔انہوں نے علم دین حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو مدرسہ میں داخل ہوئے۔ مدرسہ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا، پھر نجف جانے کا ارادہ کیا تو نجف گئے۔ وہاں سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان آئے۔ پاکستان آنے سے پہلے پاکستان آنے کا ارادہ کیا تو پاکستان آئے۔انہوں نے جتنی بھی کتب تالیف کیں پہلے ان کی تالیف کا ارادہ کیا پھر وہ کتابیں تالیف کر پائے۔ انسان دنیا حاصل کرنا چاہے یا آخرت، دونوں کے لیے ارادہ کرنا پڑتا ہے:

مِنۡكُمۡ مَنۡ يُرِيۡدُ الدُّنۡيَا وَ مِنۡكُمۡ مَنۡ يُرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ

تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طلب گار ہیں اور کچھ لوگ آخرت کے۔ (آل عمران:152)

مَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعۡيَهَا

جس نے آخرت کا ارادہ کیا اور اس کے لیے کوشش کی۔ (اسراء19)

وَ لَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَ الۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ

اور (اے رسول!) ان لوگوں کو اپنے پاس سے دور نہ کریں جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں، وہ اس کی عنایات، اس کی رضا اور اس کی خوشنودی کے طلب گار ہوتے ہیں۔ (انعام:52)

عرفان وتصوف میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان اللہ کا قرب حاصل کرنے ،اس کی معرفت حاصل کرنے اور اس کی خوشنودی و رضا حاصل کرنے اور اس راہ میں پیش آنے والی ہر رکاوٹ کو برطرف کرنے کا پختہ ارادہ کرے۔ جب تک انسان ان باتوں کا پختہ ارادہ نہ کرے وہ اس راہ پر کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ ایسا ارادہ کرنے والے کو ہی مرید کہا جاتا ہے اور ایسے مرید کی تربیت کرنے والے ماہر سالک کو پیر کہا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں پیر اور مرید کی اصطلاحیں اپنے اصلی معنی کھو چکی ہیں۔ارادہ کے بارے میں قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیات اور ایسی ہی دیگر بہت سی آیات کے ہوتے ہوئے اگر کوئی یہ کہے کہ ارادہ کی اصطلاح قرآن وسنت میں دکھا کر منہ مانگا انعام حاصل کریں تو واقعی یہ بڑی ہی غیر عالمانہ بات ہوگی۔

ارادہ کے بعد دوسری اصطلاح جو علامہ نجفی صاحب نے لکھی وہ ہے مشق و ریاضت۔ مشق اور

ریاضت ایک چیز ہیں۔مشق فارسی زبان کا لفظ ہےاور عربی میں اسے ریاضت کہتے ہیں۔انسان کوئی بھی کام کرنا چاہے،اس میں کمال حاصل کرنا چاہےتو اسے بار بار دہرانا پڑتا ہے،مشق کرنی پڑتی ہے،ریاضت کرنی پڑتی ہے۔

عرفان وتصوف میں اس بات پر تاکید کی گئی ہے کہ اپنے کردار میں سے ناپسندیدہ صفات کو نکالنےاور پسندیدہ اخلاقی صفات پیدا کرنے کے لیےایک دو بار یا کبھی کبھار کا عمل مفید نہیں ہوتا۔اس کے لیےانسان کو مسلسل مشق اور ریاضت کرنی پڑتی ہے۔

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے خود عربی کی گردانوں کواور قرآنی سورتوں اور آیات کو دہرادہرا کر ہی یاد کیا ہے۔اسی دہرانے کا نام مشق اور ریاضت ہے۔ماہ رمضان کے روزے کیا ہیں؟ تقویٰ کی مشق اور ریاضت!! ہر روز کی واجب اور مستحب نمازیں جن کی روزانہ کی تعداد اکاون رکعت بنتی ہے،درحقیقت ایک ریاضت ہے۔جو شخص دن میں یہ اکاون رکعت نماز ادا کرتا ہے وہ 102 سجدے اور 51 رکوع کرتا ہے۔مجموعی طور پر کتنی بارالحمدللہ کہتا ہے؟ کتنی باراللہ اکبر کہتا ہے؟ کتنی بار سبحان اللہ اور سبحان ربی کہتا ہے؟ یہ سب ریاضت نہیں تو کیا ہے؟

امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے دور حکومت میں بصرہ کے گورنر عثمان ابن حنیف کے نام ایک خط میں لکھا:

انما ھی نفسی اروضھا بالتقویٰ لتاتی آمنۃ یوم الخوف الاکبر

ترجمہ: میں اپنے اس نفس کو تقوی کی ریاضت کراتا ہوں تاکہ بڑے خوف والے دن (یعنی قیامت کے دن) امن کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں آئے۔ (نہج البلاغہ مکتوب:45)

اسی مکتوب میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

وایم اللہ، یمینا استنثنی فیھا بمشیئۃ اللہ، لاروضن نفسی ریاضۃ تھش معھا الی القرص

ترجمہ: اللہ کی قسم، اور اس قسم سے میں صرف اللہ کی مشیت کا استثناء کرتا ہوں،
کہ میں اپنے نفس کو ایسی ریاضت کراتا ہوں کہ یہ ایک روٹی پر بھی خوش ہوجایا کرے۔

مومنین کرام! مولا علی علیہ السلام کے اس ارشاد میں ریاضت کا کس قدر واضح الفاظ میں ذکر کیا جارہا ہے۔اب بھی اگر کوئی کہے کہ ریاضت صوفیاء کی خودساختہ عبادت ہے تو یہ بڑی نامناسب بات ہوگی۔ مولا علی نے سچ فرمایا: الناس اعداء ما جہلوا (لوگ جس چیز کا علم نہیں رکھتے اس کے دشمن بن جاتے ہیں)

قبض و بسط:

قبض تنگی اور گھٹن کی حالت کو کہتے ہیں جبکہ بسط پھیلاؤ اور گشائش کی حالت کو۔ یہ دونوں حالتیں مادی چیزوں میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں اور انسانی کی قلبی اور نفسیاتی حالات میں بھی ان کا مشاہدہ ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے دو نام القابض اور الباسط بھی ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ اگر کائنات میں قبض و بسط کی کیفیات نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ کے قابض اور باسط ہونے کا مفہوم ہی کیا رہ جاتا ہے۔ لہٰذا قبض و بسط کو صوفیاء و عرفاء کی اختراع کہنا یا سمجھنا، تصوف اور عرفان سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ مادی دنیا میں قبض و بسط کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر سائنس کے طالبعلم جانتے ہیں کہ جب کسی جسم کا درجہ حرارت کم ہوجائے تو اس کی جسامت سکڑ جاتی ہے، یعنی اس میں قبض کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کے برعکس جب کسی مادی جسم کا درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے تو اس میں پھیلاؤ پیدا ہوجاتا ہے جس کو عربی زبان میں بسط کہتے ہیں۔

جب انسان خوش ہوتا ہے تو اردو میں بھی اس کے لیے فرح و انبساط کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جب طبیعت میں بیزاری اور اداسی ہو تو اس کے لیے انقباض کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ علامہ نجفی صاحب نے اور ہر انسان نے اپنی زندگی میں اس بات کا تجربہ کیا ہے کہ بعض اوقات انسان کی قلبی کیفت کسی کام پر مائل ہوتی ہے اور انسان خوشی خوشی بہت سا کام کر لیتا ہے۔ اس کیفیت کو بسط کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس بعض اوقات انسان قلبی طور پر ایسی گھٹن، بیزاری اور اکتاہٹ محسوس کر رہا ہوتا ہے کہ اپنے پسندیدہ ترین کام کرنے پر بھی طبیعت مائل نہیں ہوتی۔ اس حالت کو قبض کہتے ہیں۔ علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے یقینا تجربہ کیا ہوگا کہ بسط کی حالت میں انہوں نے کسی کتاب کے کئی صفحات لکھ لیے ہوں گے لیکن قبض کی حالت میں ایک سطر لکھنے پر بھی طبیعت مائل نہیں ہوتی۔

یہی حال عبادات میں بھی ہوتا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ایک روایت میں ہے:

ان للقلوب اقبالا و ادبارا، فاذا اقبلت فاحملوھا علی النوافل

و اذا ادبرت فاقتصروابھا علی الفرائض

ترجمہ: دل کبھی عبادت کی طرف مائل ہوتے ہیں اور کبھی مائل نہیں ہوتے۔ جب مائل ہوں تو انہیں نوافل میں لگا دیا کرو جب مائل نہ ہوں تو فرائض تک محدود کر دیا کرو۔ (بحارالانوار جلد 84 صفحہ 30)

دلوں کے اقبال (یعنی مائل بہ عبادت ہونے) اور ادبار (یعنی مائل بہ عبادت نہ ہونے) کی وجہ بسط اور قبض ہیں۔ اور قبض و بسط کے بہت سے عوامل و اسباب ہیں جن کی تفصیل میں جانا یہاں ہمارا مقصد نہیں ہے۔

اب یہ اعتراض نہ کر دیا جائے کہ حدیث میں اقبال و ادبار کے الفاظ ہیں تو عرفاء و صوفیاء نے قبض و بسط کے الفاظ کیوں استعمال کیے۔ حدیث میں قبض و بسط کے اثر یعنی اقبال و ادبار کا ذکر ہے جبکہ صوفیاء و عرفاء کی یہ اصطلاح ادبار و اقبال کے سبب کو بیان کر رہی ہیں۔ قبض کا نتیجہ اور اثر ادبار ہے اور بسط کا نتیجہ اور اثر اقبال ہے۔ درحقیقت عرفان و تصوف کی ان اصطلاحات پر اعتراض و تنقید جہالت و لاعلمی اور تعصب و عناد کا نتیجہ ہے جس کی کوئی علمی قدر و قیمت نہیں ہے۔ مراقبہ اور ذکر خفی و ذکر جلی کے شرعی ہونے کے واضح دلائل ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ اب ہم نہیں جانتے کہ علامہ نجفی صاحب منہ مانگا انعام دینے کے وعدے پر قائم ہیں یا نہیں۔

وحدت الوجود:

وحدت الوجود کی بحث فلسفہ و عرفان کی مشکل ترین ابحاث میں سے ہے۔ چونکہ عرفان و تصوف کے مخالفین وحدت الوجود کی آڑ میں عام مومنین کو آسانی سے بدگمان کر لیتے ہیں لہٰذا اس مسئلہ پر گفتگو بہت ضروری ہے۔ دوسری طرف سے ہمارے ملک میں فلسفہ پڑھنے پڑھانے کا رجحان تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ یونیورسٹیوں میں فلسفہ کے شعبے تقریباً ویران پڑے ہوئے ہیں۔ فلسفہ سے نا آشنا عام مومنین کی ذہنی اور علمی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلہ پر آسان پیرائے میں گفتگو کرنا ایک انتہائی مشکل کام ہے۔ مشکل ہونے کے ساتھ ساتھ اہل فلسفہ کی نظر میں یہ بات ایک گناہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ فلسفہ کے مسائل کو عوام کے لیے آسان زبان میں بیان کیا جائے۔ لیکن یہ کام کرنا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا فلاسفہ و عرفاء سے معذرت

کے ساتھ ہم اپنی کاوش مومنین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ ہم قارئین سے یہ گزارش کریں گے کہ اس بحث کا آرام وسکون سے چند بار مطالعہ کریں تا کہ مفہوم اچھی طرح آپ پر کھل سکے۔فارسی اور فلسفہ جاننے والے احباب سے گزارش ہے کہ فلسفی انداز میں اس بحث سے لطف اندوز ہونے کے لیے مرتضیٰ مطہری شہید کی کتب ''درسہای منظومہ'' اور ''اصول فلسفہ وروش ریالیسم'' میں وحدت الوجود کی بحث کو دیکھ لیں۔

اس سے پہلے کہ وحدت الوجود کے مسئلہ پر گفتگو کی جائے یہ جاننا ضروری ہے کہ نظریہ وحدت الوجود کس سوال کا جواب ہے؟ بنیادی طور پر ہر نظریہ کسی سوال کا جواب ہوتا ہے۔مسئلہ وحدت الوجود کی حقیقت بھی اس وقت تک صحیح طرح سے سمجھ نہیں آ سکے گی جب تک اس بنیادی سوال کو نہ سمجھا جائے جس کے مختلف جوابات میں سے ایک جواب نظریہ وحدت الوجود ہے۔ یہ سوال سامنے نہیں ہوگا تو پھر اس قسم کی بے تکی اور بے بنیاد باتیں ہوں گی کہ صوفیاء بنیادی طور پر توحید کے مخالف ہیں، پہلے انہوں نے حلول کا نظریہ پیش کیا لیکن جب دیکھا کہ حلول کا نظریہ لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں ہے تو انہوں نے اپنا انداز بدلا اور اپنی بات وحدت الوجود کی شکل میں پیش کر دی۔ یہ سب فضول جاہلانہ باتیں ہیں جو ان لوگوں کی طرف سے کی جاتی ہیں جنہیں اس بات کا شعور ہی نہیں ہے کہ نظریہ وحدت الوجود کس سوال کا جواب ہے اور اس سوال کے دوسرے جوابات کیا ہیں؟

ہمیں کائنات میں ہر طرف انواع اقسام کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ان چیزوں کی تعداد ہمارے حساب سے بھی باہر ہے۔سوال یہ ہے کہ یہ انواع واقسام کی چیزیں جو ہمارے لیے ناقابل حساب ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے؟ ان سب کا آپس میں کیا تعلق ہے اور ان کا ان کے خالق کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ کیا یہ سب اپنی اپنی جگہ پر مستقل اور حقیقی وجود رکھتے ہیں؟ یا کسی ایک حقیقت کے مختلف اظہارات ہیں؟ یہ ہے وہ بنیادی سوال جس کے جوابات میں سے ایک جواب نظریہ وحدت الوجود ہے۔اس سوال کے تین جوابات دیئے گئے ہیں:

1۔ان موجودات میں سے ہر موجود کا اپنی جگہ پر مستقل اور حقیقی وجود ہے۔اس نظریہ کو نظریہ کثرت الوجود کہتے ہیں۔یہ نظریہ مشائین کی طرف منسوب ہے جن کی ترجمانی بوعلی سینا کرتے ہیں۔

2۔ اصل اور حقیقی وجود ایک ہی وجود ہے جو کامل و مطلق ہے اور باقی موجودات اصل اور حقیقی وجود نہیں رکھتے۔ان کا وجود اعتباری ہے۔اس نظریہ کو نظریہ وحدت الوجود کہتے ہیں۔

3۔ یہ سب موجودات وجود رکھتے ہیں، ان کا وجود حقیقی ہے اعتباری نہیں ہے لیکن ان کا وجود ایک اصل اور ایک حقیقی وجود کی تجلی ہے۔اسے کثرت در وحدت اور وحدت در کثرت کہتے ہیں۔

علامہ محمد حسین نجفی دام ظلہ اور ان کے ہم مشرب افراد جو نظریہ وحدت الوجود کو کفر و شرک سمجھتے ہیں وہ لامحالہ کثرت الوجود کو صحیح مانتے ہوں گے یا وحدت در کثرت اور کثرت در وحدت کو۔ان سے ہماری انتہائی مودبانہ گزارش ہے کہ یہ واضح فرمائیں کہ اگر ان کی نظر میں نظریہ وحدت الوجود کفر و شرک ہے تو کیا وہ کثرت الوجود کے قائل ہیں یا کثرت در وحدت و وحدت در کثرت کے؟ اگر وہ کہیں کہ ہم تو قرآن و سنت کے عالم ہیں اور قرآن و سنت میں اس قسم کی باتیں کہیں نظر ہی نہیں آتی ہیں تو ان کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ گویا آپ نے اعتراف کر لیا ہے کہ آپ منقولات کے عالم ہیں اور معقولات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔بنابریں آپ کو ان مسائل پر بات کرنے کا حق ہی نہیں ہے۔اب آتے ہیں وحدت الوجود کی بحث پر۔

اس موضوع پر گفتگو کا آغاز استاد مطہری رضوان اللہ علیہ کے ایک اقتباس سے کرتے ہیں۔وہ اپنی کتاب عرفان حافظ میں تحریر فرماتے ہیں:

" لبید بن ربیعہ عرب کے نامور شعراء میں سے تھا۔ایمان لانے کے بعد وہ ایک سچا مومن بن گیا اور قرآن کے حسن بیان سے اس قدر متاثر ہوا کہ شعر کہنا ترک کر دیا۔اس نے زمانہ جاہلیت میں ایک شعر کہا تھا:

الا کل شیء ما خلا اللہ باطل و کل نعیم لامحالہ زایل

ترجمہ: اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے باطل ہے اور ہر نعمت نے لامحالہ زائل ہو کر رہنا ہے۔

منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

اصدق بیت قالتہ العرب

ترجمہ: یہ سب سے سچا شعر ہے جو عربوں میں کہا گیا۔

عرفاء بھی اسی مصرعہ سے چپکے ہوئے ہیں کہ **الا کل شی ءما خلا اللہ باطل** کہ اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہ باطل الذات ہے۔‘‘ (شہید مرتضیٰ مطہری عرفان حافظ: 104)

وحدت الوجود کے دو پہلو ہیں، ایک فلسفیانہ اور دوسرا عارفانہ یا صوفیانہ۔ ان دونوں کا مختصر بیان:

وحدت الوجود کے فلسفیانہ معنی:

ان جملوں پر غور فرمائیں:

زمین موجود ہے۔ آسمان موجود ہے۔ پہاڑ موجود ہے۔ سورج موجود ہے۔ پانی موجود ہے۔ انسان موجود ہے۔

یہ چھ جملے ہیں۔ ان میں زمین، آسمان، پہاڑ، سورج، پانی اور انسان میں سے ہر ایک کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ’’ موجود‘‘ ہے۔ زمین، آسمان، پہاڑ، سورج، پانی اور انسان میں سے ہر چیز دوسری چیزوں سے مختلف ہے، لیکن ان میں ایک بات مشترک ہے کہ وہ سب ’’موجود‘‘ ہیں، یعنی وجود رکھتے ہیں، ان کے درمیان فرق ہے زمین، آسمان، پہاڑ، سورج، پانی اور انسان ہونے کے لحاظ سے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ’’وجود‘‘ کیا ہے؟ وجود کی تعریف کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ’’وجود‘‘ کا مفہوم ان مفاہیم میں سے ہے جو بہت واضح ہیں، اس قدر واضح کہ اس کی تعریف بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کے بارے میں مشہور فلسفی ملا ہادی سبزواری نے اپنی کتاب منظومہ میں کہا ہے:

مفهومه من اعرف الاشياء وكنهه في غاية الخفاء

ترجمہ: وجود کا مفہوم معروف ترین اشیاء میں سے ہے لیکن اس کی حقیقت انتہائی پوشیدہ ہے۔

وجود کے مفہوم کے واضح ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا بچہ بھی کسی چیز کے ’’موجود ہونے‘‘ اور ’’موجود نہ ہونے‘‘ کے فرق کو جانتا ہے۔ اگر بچہ کہے کہ مجھے آئس کریم کھانی ہے اور اسے کہا جائے کہ آئس کریم فریج میں ہے، جا کر لے لو، اور بچہ فریج کھول کر دیکھے کہ وہاں آئس کریم موجود نہیں ہے تو وہ سمجھ جائے گا کہ اس سے جھوٹ بولا گیا ہے۔ یا یہ کہ اسے کہا جائے کہ آئس کریم ہے تو نہیں لیکن تم فریج میں سے نکال کر کھا لو۔ تو وہ بچہ کہے گا کہ اگر فریج میں موجود ہی نہیں ہے تو فریج سے نکال کر کیسے کھا لوں؟ وہ بخوبی جانتا

ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی چیز بیک وقت ہو بھی اور نہ بھی ہو، اگر ہے تو یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ ''نہیں ہے'' اور اگر ''نہیں ہے''، تو یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ ''وہ ہے''۔

ایک بچے کے سامنے کہا جاتا ہے کہ پانڈا موجود ہے۔ بچہ پوچھتا ہے کہ پانڈا کیا ہے؟ اسے جواب دیا جاتا ہے کہ پانڈا ایک جانور ہے۔یعنی ''پانڈا موجود ہے'' سن کر بچے کو یہ معلوم ہوگیا کہ پانڈا نام کی کوئی چیز وجود رکھتی ہے۔لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ پانڈا کیا ہے۔ جب اسے جواب دیا گیا تو اسے معلوم ہوگیا کہ وہ ایک جانور ہے۔ جب کسی چیز کے موجود ہونے کا علم ہو جانے کے بعد یہ پوچھا جائے کہ وہ کیا چیز ہے؟ تو اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا جائے گا فلسفہ کی اصطلاح میں اسے ماہیت کہا جاتا ہے۔مندرجہ بالا چھ جملوں میں زمین، آسمان، پہاڑ، سمندر، سورج اور انسان ماہیات ہیں، اور ان میں سے ہر ایک موجود بھی ہے۔ یہ سب موجودات ''وجود'' میں مشترک ہیں، اور ''ماہیت'' میں مختلف ہیں۔

فلاسفہ کے دو گروہ ہیں، ایک وہ جو کہتے ہیں کہ ماہیت اصل ہے اور وجود فرع ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وجود اصل ہے اور ماہیت فرع ہے اور اعتباری ہے۔ ماہیت کو اصل جاننے کے نظریے کو ''اصالۃ الماہیۃ'' کہا جاتا ہے اور وجود کو اصل جاننے کے نظریے کو ''اصالۃ الوجود'' کہا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا چھ مثالوں میں زمین، آسمان، پہاڑ، سورج، پانی اور انسان کے وجود میں ایک ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ پہاڑ سمندر ہے اور سمندر پہاڑ ہے، انسان سورج ہے اور سورج انسان ہے۔ وجود میں ایک ہونے کے باوجود زمین زمین ہے، آسمان آسمان ہے، پہاڑ پہاڑ ہے وعلی ہذا القیاس۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اللہ کے بارے میں بات کی جائے تو بات یہ ہوگی کہ اللہ موجود ہے۔ کروڑوں بلکہ اربوں کھربوں موجودات پر مشتمل کائنات بھی موجود ہے۔ موجود ہونے میں اللہ اور کائنات ایک ہیں لیکن اللہ اللہ ہے کائنات کائنات ہے۔ جس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ سورج موجود ہے، سمندر موجود ہے۔ اس کے باوجود یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ سورج سمندر ہے یا سمندر سورج ہے، اسی طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ کائنات موجود ہے، اللہ موجود ہے۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ کائنات اور کائنات کی ہر چیز خدا ہے اور خدا ہر چیز ہے۔ وحدت الوجود کے جو مخالفین کہتے ہیں کہ وحدت الوجود کا یہ مطلب ہے کہ ہر چیز خدا ہے اور خدا ہر چیز ہے، درحقیقت وہ وحدت الوجود کو سمجھتے ہی نہیں۔ اور اگر سمجھتے ہیں اور سمجھنے کے باوجود ایسا کہتے ہیں تو وہ عوام کو گمراہ

کرنے کے لیے جھوٹ اور بے ایمانی سے کام لیتے ہیں۔

فلسفہ میں جب وحدت الوجود کا ذکر ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وجود کا لفظ جب، جہاں اور جس بھی چیز کے بارے میں استعمال کیا جائے اس کے معنی ایک ہی ہوتے ہیں کہ وہ چیز موجود ہے، اور اس کی ضد کو عدم کہتے ہیں۔

وحدت الوجود کے عارفانہ معنی:

اس سے پہلے کہ ہم وحدت الوجود کے عرفانی مفہوم پر بات کریں، مسئلہ کو آسان کرنے کے لیے ایک مثال کی مدد لیتے ہیں اور وہ مثال ہے آئس اینڈ سنو فیسٹیول (Ice and Snow Festival) کی جو چین کے صوبے ''ہی لونگ جیانگ'' کے دارالحکومت ہربن میں ہر سال پانچ جنوری کو شروع ہوتا ہے اور ایک ماہ تک جاری رہتا ہے۔ اس میلے میں برف سے ایک مصنوعی شہر بنایا جاتا ہے جس میں ہر چیز برف کی بنی ہوتی ہے۔ بڑی بڑی عمارتیں، بلند و بالا مینار، سڑکیں، باغات، درخت، درختوں پر لگے ہوئے پھل، پھول، پتے، جانوروں کے مجسمے، الغرض ہر وہ چیز جو کسی شہر میں قدرتی طور پر ہوتی ہے وہ یہاں موجود ہوتی ہے۔ وہاں جا کر آپ کو ایسا لگتا ہے جیسے واقعی آپ کسی شہر میں آ گئے ہیں۔ ہر چیز دیکھنے میں بالکل قدرتی لگتی ہے لیکن ہوتی برف کی ہے۔ آپ وہاں جو کچھ دیکھتے ہیں وہ دیکھنے میں مختلف نظر آتا ہے، ان کی شکل مختلف ہوتی ہے، رنگ مختلف ہوتا ہے لیکن حقیقت میں سب پانی ہے۔ یعنی یہ سب چیزیں جو بظاہر مختلف لگتی ہیں حقیقت میں ایک ہیں اور وہ ہے پانی۔

ایک عارف اور فلسفی جب کائنات کی مختلف چیزوں کو دیکھتے ہیں تو بظاہر سب چیزیں مختلف نظر آ رہی ہوتی ہیں، لیکن حقیقت میں سب ایک ہیں اور وہ ہے ''وجود''۔ بالکل اسی طرح جس طرح آئس اینڈ سنو فیسٹیول میں ہر چیز مختلف دکھائی دینے کے باوجود حقیقت میں ایک ہی چیز ہے یعنی پانی اور پانی ایک ہی ہے۔ لیکن عارف ایک قدم آگے بڑھ کر جب ان سب موجودات کے وجود کو اللہ کے وجود کے سامنے دیکھتا ہے تو اللہ کے وجود کے سامنے ان کا وجود اس قدر ناچیز ہوتا ہے کہ وجود لگتا ہی نہیں اور یہ ناچیز وجود بھی ہر لحاظ سے اللہ کا عطا کردہ وجود مستعار و ناپائیدار۔ اس مقام پر عارف بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ وجود تو ایک ہی ہے اور وہ اللہ کا وجود ہے۔ اسے کہتے ہیں وحدت الوجود۔ رومی اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

ما کہ باشیم ای تو مارا جان جان　　　　تا کہ ما باشیم با تو درمیان

ما عدمہا ایم ہستی ہا نما　　　　تو وجود مطلق و ہستی ما

ترجمہ: اے ہماری جان کی جان، ہماری کیا حیثیت اور ہستی ہے

کہ ہم تیرے سامنے آ کر موجود ہونے کا دعویٰ کریں،

تیرے سامنے تو ہم ہستی نما عدم ہیں، تو وجود مطلق ہے

اور ہماری ہستی اور ہمارا وجود تجھ سے ہے۔　　(مثنوی دفتر اول)

وحدت الوجود کے تصور کو واضح کرنے کے لیے عموماً جو مثال دی جاتی ہے وہ روشنی کی مثال ہے اس لیے کہ فلسفہ وعرفان میں وجود کو نور اور عدم کو ظلمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سورج کی روشنی روشنی ہے، چاند کی روشنی بھی روشنی ہے، ہزار واٹ کے بلب کی روشنی بھی روشنی ہے، زیرو واٹ کے بلب کی روشنی بھی روشنی ہے۔ روشنی ہونے میں سب ایک ہیں، سب روشنی ہیں لیکن ان کے درجات مختلف ہیں۔ اب اگر سورج کی روشنی بھی روشنی ہے اور زیرو کے بلب کی روشنی بھی روشنی ہے تو ان دونوں روشنیوں کو روشنی ہونے کی حیثیت سے تو ایک کہا جا سکتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ زیرو کا بلب اور سورج ایک ہیں۔ نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیرو کا بلب سورج ہے اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ سورج زیرو کا بلب ہے۔ زیرو کا بلب زیرو کا بلب ہی کہلائے گا اور سورج سورج کہلائے گا اس کے باوجود یہ بھی صحیح ہے کہ روشنی ہونے کی حیثیت سے دونوں ایک ہیں، دونوں اپنی اپنی شدت کے لحاظ سے تاریکی میں روشنی فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح کائنات میں کروڑوں بلکہ اربوں کھربوں چیزیں موجود ہیں، لیکن وجود کی حیثیت سے ان سب کا ایک درجہ نہیں ہے۔ کامل ترین اور حقیقی وجود اللہ تعالیٰ کا وجود ہے۔ اس کے سوا باقی جتنے موجودات ہیں ان کا وجود ناقص اور ناپائدار ہے، وجود مستعار ہے۔

اس کی ایک اور مثال بھی دی جاتی ہے اور وہ پانی کی مثال ہے۔ سمندر بھی پانی ہے، دریا بھی پانی ہے، نہر بھی پانی ہے، ایک چھوٹا سا برساتی نالہ بھی پانی ہے، آپ کے گھر میں غسل خانے میں بالٹی یا ٹب میں رکھا ہوا پانی بھی پانی ہے، کھانے کی میز پر گلاس میں پڑا ہوا پانی بھی پانی ہے اور اگر پانی کا ایک قطرہ میز پر گر

جائے تو وہ بھی پانی ہے۔ پانی ہونے کی حیثیت سے سب ایک ہیں، پانی ہونے کی حیثیت سے سب کی حقیقت ایک ہے لیکن درجات مختلف ہیں، قطرہ اور سمندر دونوں پانی ہیں لیکن قطرے کو سمندر اور سمندر کو قطرہ نہیں کہا جا سکتا۔ قطرے اور سمندر دونوں کو پانی کہا جا سکتا ہے لیکن قطرے کو سمندر اور سمندر کو قطرہ نہیں کہا جا سکتا۔

تھوڑی دیر کے لیے وجود مطلق کی بحث کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور مادی موجودات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ مادی دنیا میں ہمیں جتنی بھی چیزیں نظر آتی ہیں وہ یا عناصر ہیں یا مرکبات ہیں جو مختلف عناصر سے مل کر بنی ہیں۔ مثال کے طور پر ہائیڈروجن عنصر ہے، آکسیجن عنصر ہے۔ پانی مرکب ہے جو ہائیڈورجن اور آکسیجن سے مل کر بنتا ہے۔ ہائیڈروجن کے دو ایٹم اور آکسیجن کا ایک ایٹم مل کر پانی کا ایک مالیکیول بناتے ہیں۔ یعنی پانی کے ایک مالیکیول میں تین ایٹم ہیں، دو ہائیڈروجن کے، ایک آکسیجن کا۔ ہمارے گھروں میں جو نمک استعمال ہوتا ہے اس کا سائنسی نام سوڈیم کلورائید ہے جس کے ہر مالیکیول میں ایک ایٹم سوڈیم کا ہے اور ایک ایٹم کلورین کا۔ جو شکر ہم روزانہ استعمال کرتے ہیں جسے ہم چینی کہتے ہیں وہ بھی مرکب ہے۔ اس کے ایک مالیکیول میں کاربن کے 12، ہائیڈرجن کے 22 اور آکسیجن کے 11 ایٹم ہوتے ہیں۔ یعنی چینی کے ایک مالیکیول میں 45 ایٹم ہوتے ہیں۔ علی ہذا القیاس، ہم اپنے اردگرد جتنی بھی مادی چیزیں دیکھتے ہیں اگرچہ دیکھنے میں مختلف لگتی ہیں، لیکن اصل میں سب ایٹم ہیں۔ اگر ایٹم کو توڑا جائے تو وہ ایٹمی توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس طرح مادی دنیا میں نظر آنے والی ہر چیز دوسری سے مختلف ہونے کے باوجود ان سب کی حقیقت ایک ہے، کہ وہ سب ایٹم ہیں اور ایٹم کے بعد اگلے مرحلے پر توانائی ہیں۔ اس کے باوجود سب مختلف بھی ہیں۔ اگر آپ کے کھانے کی میز پر پانی، نمک اور شکر رکھی ہوئی ہے تو درحقیقت یہ سب ایٹم ہیں اور اس سے اگلے مرحلے پر توانائی ہیں۔ سب کی اصل ایٹم ہونے کے باوجود ہم نمک کو شکر اور شکر کو نمک نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح جتنی بھی چیزیں موجود ہیں وہ سب ایک ہی حقیقت کے مختلف درجات اور مختلف شکلیں ہیں جس کا نام وجود ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا وجود ہر لحاظ سے کامل وجود ہے، اس کا وجود ذاتی وجود ہے، اس میں کسی قسم کا نقص، عیب اور کمزوری نہیں پائی جاتی، جبکہ باقی جتنی بھی اشیاء ہیں ان کا وجود ذاتی نہیں، بلکہ اللہ

کا عطا کردہ وجود ہے، جو محدود بھی ہے، محتاج بھی ہے اور بہت سے دیگر نواقص کا حامل بھی ہے۔ وجود کی حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کا وجود اور کائنات کی دیگر اشیاء وجود میں ایک ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر چیز اللہ ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وحدت الوجود کے قائلین کے نزدیک ہر چیز خدا ہے۔ وجود اور وجود کے مختلف درجات کی تشریح کرنے کے بعد شیخ محمود شبستری گلشن راز میں کہتے ہیں:

ہر مرتبہ از وجود حکمی دارد　　گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

ترجمہ: وجود کے مختلف مراتب ہیں، ان میں سے ہر مرتبہ کا اپنا الگ حکم ہے، اگر تم وجود کے مراتب کا لحاظ کیے بغیر سب کو ایک جیسا مقام اور مرتبہ دو گے تو تم زندیق ہو گے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وحدت الوجود کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز خدا ہے وہ یا تو وحدت الوجود کے معنی نہیں جانتے یا پھر صرف لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے جھوٹ بولتے ہیں۔

وحدت الوجود کی تشریحات:

نظریہ وحدت الوجود پر تنقید کرنے والے فلسفہ وعرفان سے نا آشنا فقہاء ومحدثین نے عام طور پر صرف وحدت الوجود کا نام سنا ہے اور اس کے بارے میں کچھ سنی سنائی عامیانہ باتوں کے سوا نظریہ وحدت الوجود سے کوئی آشنائی نہیں رکھتے حالانکہ یہ ایک انتہائی گہرا اور وسیع موضوع ہے۔ جو لوگ وحدت الوجود کے قائل ہیں ان کے ہاں بھی اس کی مختلف تعبیرات وتشریحات پائی جاتی ہیں۔ آیت اللہ محمد تقی جعفری رضوان اللہ علیہ اپنی کتاب ''تفسیر ونقد وتحلیل مثنوی کی پہلی جلد کے صفحہ 292 پر تحریر فرماتے ہیں: '' فلسفہ مشرق کے عظیم استاد آقای میرزا مہدی آشتیانی نے ایک رسالہ میں وحدت الوجود کے بارے میں اڑتالیس نظریات بیان کیے ہیں''۔

بہرحال یہاں ہم اپنے معاشرے کے تعلیم یافتہ افراد کی عمومی ذہنی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے تین تعبیرات کے بارے میں اختصار کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں:

1۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ حقیقی وجود اللہ تعالیٰ کا وجود ہے، اس کے علاوہ جو کچھ نظر آتا ہے ان کا وجود حقیقی وجود نہیں ہے، ان کا وجود اس قدر حقیر اور ناچیز ہے کہ اللہ کے وجود کے سامنے اسے وجود

کہنا درست نہیں ہے۔

تشریح: اس تعبیر کو سمجھنے کے لیے اس مثال پر غور فرمائیں:

(i) پانچ افراد کا تصور کریں: ان میں سے ایک شخص کے پاس سو روپیہ ہے، دوسرے کے پاس دو سو روپیہ ہے، تیسرے کے پاس پانچ سو روپیہ ہے، چوتھے کے پاس ایک ہزار روپیہ اور پانچویں کے پاس ایک ارب روپیہ ہے۔ ان میں سے مالدار کسے کہا جائے گا؟ ظاہر سی بات ہے کہ ان پانچ افراد میں سے ایک ارب کے مالک کو ہی مالدار کہا جائے گا۔ سو، دو سو، پانچ سو اور ایک ہزار روپیہ کے مالک کو مالدار نہیں کہا جائے گا حالانکہ مالیت ان میں بھی پائی جاتی ہے۔ منطقی لحاظ سے ان کی مالیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سو، دو سو، پانچ سو اور ہزار روپیہ میں مالیت ہونے کے باوجود ان کے مالک کو مالدار نہیں کہا جاتا۔ اگر ایک ہزار روپیہ اور ایک ارب روپیہ کے درمیان نسبت قائم کی جائے تو 1:100000 (ایک اور ایک لاکھ) کی نسبت قائم ہوتی ہے۔ یعنی ایک ارب والے کے پاس ایک ہزار والے سے ایک لاکھ گنا زیادہ مالیت موجود ہے، (یعنی اس کے پاس ایک ہزار والے ایک لاکھ نوٹ موجود ہیں)۔ اسی طرح سو روپیہ اور ایک ارب روپیہ کے درمیان 1:1000000 (ایک اور دس لاکھ) کی نسبت قائم ہوتی ہے۔ یعنی ایک ارب والے کے پاس ایک سو والے کی نسبت دس لاکھ گنا زیادہ مالیت موجود ہے۔ لیکن ساری کائنات کے وجود اور اللہ تعالیٰ کے وجود کے درمیان کوئی نسبت قائم نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ نسبت دو محدود مقداروں کے درمیان قائم ہو سکتی ہے۔ جہاں ایک طرف محدود مقدار ہو چاہے کتنی ہی زیادہ ہو اور دوسری طرف لامحدود ہو تو ان کے درمیان کوئی نسبت قائم نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ کا وجود ہر لحاظ سے لامحدود ہے جبکہ انسانی ذہن کی وسعتوں میں نہ آنے والی وسیع و عریض کائنات بہر حال محدود ہے اور اللہ تعالیٰ کے لامحدود وجود کے سامنے اس کی حیثیت ایک روپیہ اور ایک ارب روپیہ کی نسبت سے بھی کم ہے۔ ایک روپیہ کی ایک ارب روپیہ کے سامنے پھر بھی کچھ حیثیت ہے کہ وہ ایک ارب کا اربواں حصہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود جس طرح عرف عام میں سو، دو سو، پانچ سو اور ایک ہزار روپیہ کی ایک ارب کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے لامحدود وجود کے سامنے اس سے بھی زیادہ حقیر، ناچیز اور بے حیثیت ہے۔ جس طرح ایک ارب کے مالک کے سامنے ایک ہزار روپیہ کے مالک کو مالدار نہیں کہا جا سکتا اس سے کہیں بڑھ کر اللہ کے وجود کے سامنے

کائنات کی کسی چیز کے وجود کو حتیٰ کہ پوری کائنات کے وجود کو وجود نہیں کہا جا سکتا۔

(ii)۔اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی چیز موجود نہیں ہے۔حقیقی وجو صرف اللہ تعالیٰ کا وجود ہے،اس کے علاوہ جو کچھ نظر آتا ہے ان کا وجود آئینے میں موجود عکس کی مانند ہے۔

تشریح:اگر آپ کے اردگرد چھوٹے بڑے بہت سے آئینے رکھ دیئے جائیں اوران آئینوں میں آپ کا عکس نظر آرہا ہوتو وہ عکس حقیقت نہیں رکھتا۔اصل حقیقت آپ کی ہے۔آپ درمیان سے نکل جائیں تو آئینوں میں کوئی عکس بھی باقی نہیں رہے گا۔وحدت الوجود کی اس تعبیر کے مطابق کائنات میں جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے وجود اوراس کی صفات کے جلوے ہیں۔انسان جس چیز میں بھی غور کرے اسے اس میں اللہ کے وجود اور اللہ کے علم ،اللہ کی قدرت ،اللہ کے ارادے،اللہ کی صفات کمال وجمال جلوہ گر نظر آئیں گی۔

صوفیاء اور عرفاء کے مخالفین ان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ ہر چیز کو خدا کہتے ہیں۔یہ بہت بڑا بہتان ہے۔وحدت الوجود کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ہر چیز خدا ہے،اس کے معنی یہ ہیں کہ حقیقی وجود صرف اللہ کا وجود ہے جو واحد، احد اور لاشریک ہے۔وحدت الوجود کا نظریہ غیر خدا کے حقیقی وجود کی نفی کرتا ہے نہ یہ کہ اس کے وجود کا اثبات کر کے اسے خدا مانتا ہو۔غیر اللہ سے وجود کی نفی بھی اسی معنی میں کی جاتی ہے جس طرح ارب پتی کے مقابل ایک روپیہ کے مالک سے مالدار ہونے کی نفی کی جاتی ہے۔اس سلسلے میں ایک حدیث ملاحظہ فرمایئے:

ان جمیع ما طلعت علیہ الشمس فی مشارق الارض و مغاربھا ،بحرھا و برھا ، سھلھا و جبلھا عند ولی من اولیآء اللہ و اھل المعرفۃ بحق اللہ کفیء الظلال

ترجمہ: وہ سب چیزیں جن پر سورج چمکتا ہے، وہ زمین کے مشرق میں ہوں یا مغرب میں،سمندروں میں ہوں یا خشکی میں،صحراؤں میں ہوں یا پہاڑوں میں، اللہ کے اولیاء میں سے کسی ولی اور اللہ کے حق کی معرفت رکھنے والوں کے نزدیک ڈھلتے ہوئے سائے کی مانند ہیں۔ (بحارالانوار 75:306)

سایہ موجود تو ہوتا ہے لیکن ہر عقل مند انسان سمجھ سکتا ہے کہ سائے کے وجود کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟

ایک حقیقی عارف جس چیز کو دیکھتا ہے اسے اس کے ساتھ اللہ نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز پر محیط ہے:

اَلَا اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْط

ترجمہ: خبردار وہ (اللہ) ہر چیز پر محیط ہے۔ (فصلت:54)

نیز وہ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کے ارکان اور بنیادوں کو اللہ تعالیٰ کے اسماء سے بھرا ہوا دیکھتا ہے جو عین ذات ہیں۔

وباسمائک التی ملاءت ارکان کل شیء

ترجمہ: اور تیرے اسماء کے وسیلے سے تجھ سے دعا مانگتا ہوں جن سے ہر چیز کے ارکان بھرے ہوئے ہیں۔

ذرے سے لے کر آفتاب تک اور آفتاب سے لے کر کہکشاں تک اور اربوں کہکشانوں پر مشتمل اس کائنات کی ہر چیز پر اللہ محیط ہے۔ جو بھی صاحب بصیرت ہے وہ ہر چیز پر اللہ کے اس احاطے کو اور اس چیز کی بے مقداری کو دیکھتا ہے۔ جو اندھا ہے وہ ان بے مقدار چیزوں کو دیکھتا ہے مگر ان پر احاطہ رکھنے والے اللہ کو نہیں دیکھتا۔ ایسی ہی آنکھ کے بارے میں سید الشہداء علیہ السلام نے دعائے عرفہ میں فرمایا:

متیٰ غبت۔۔۔، عمیت عین لاتراک۔۔۔

ترجمہ: تو غائب تھا ہی کب؟۔۔۔ اندھی ہے وہ، آنکھ جو تجھے نہیں دیکھتی۔۔۔

قرآن مجید کی یہ آیت بھی وحدت الوجود کے بارے میں بہت واضح رہنمائی کرتی ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (سب اچھے نام صرف اللہ ہی کے ہیں۔ اعراف 180)

عربی گرائمر کی رو سے اس آیت میں لِلّٰهِ کا الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی سے پہلے آنا حصر کا مفہوم رکھتا ہے۔ یعنی اچھے نام صرف اللہ کے ہیں، اچھے ناموں کا کوئی حقیقی حقدار ہے تو صرف اللہ ہے، اچھے نام حقیقی معنوں میں کسی پر صادق آتے ہیں تو صرف اللہ پر۔ اچھے ناموں سے مراد سب صفات کمال ہیں جیسے عالم، قادر، حی، مالک، خالق، رازق اور دیگر تمام اسمائے حسنیٰ۔ اس آیت کی رو سے اگر کوئی حقیقی عالم ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اگرچہ ہم اور بھی بہت سے موجودات کو عالم کہتے ہیں۔ علامہ محمد حسین نجفی دام ظلہ کو بھی

عالم کہا جاتا ہے لیکن جب ان کے علم کا اللہ کے علم سے موازنہ کیا جائے تو پھر انہیں عالم کہنے کی جرات کوئی نہیں کر سکے گا۔ اس لیے کہ اللہ کے علم کے سامنے ان کے علم کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ اسی طرح کسی کے بھی علم کی اللہ کے علم کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بڑے سے بڑے طاقتور کی طاقت اور قوت اللہ کی طاقت اور قوت کے سامنے ضعف، عجز اور ناتوانی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بڑے سے بڑے حاکم اور بادشاہ کی حاکمیت اور بادشاہی کا اللہ کی بادشاہی سے موازنہ کیا جائے تو اللہ کی حاکمیت اور بادشاہت کے سامنے وہ ایک فقیر اور گدا ہے۔ یہی بات وجود پر صادق آتی ہے کہ وہ سب چیزیں جنہیں موجود سمجھا جاتا ہے ان کا وجود اللہ تعالیٰ کے وجود کے سامنے ایسا ہی ہے جیسے میرا یا علامہ نجفی صاحب کا علم اللہ کے علم کے سامنے۔ جس طرح ہر عالم کا علم اللہ کے علم کے سامنے جہل ہے، ہر صاحب قدرت کی قدرت اللہ کی قدرت کے سامنے عجز و ناتوانی ہے، اسی طرح ہر موجود کا وجود اللہ کے وجود کے سامنے عدم ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر یہ کہا جائے کہ اللہ ایک ہے تو اسے توحید ذاتی کہا جائے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ جتنی بھی صفات کمال ہیں ان کا حقیقی مصداق صرف اللہ تعالیٰ ہے تو اسے توحید صفات کہا جائے گا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ تمام موجودات میں حقیقی وجود صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، کسی اور کا وجود حقیقی اور مستقل وجود نہیں ہے تو اسے توحید وجودی کہہ سکتے ہیں۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں وحدت الوجود کہا جاتا ہے۔

وحدت الوجود کے بارے میں شیخ سعدی کا خوبصورت بیان:

مگر دیدہ باشی کہ در باغ و راغ — بتابد بشب کرمکی چون چراغ

یکی گفتش ای مرغکی شب فروز — چہ بودت کہ بیرون نیائی بروز

ببین کاتشی کرمک خاکزاد — جواب از سر روشنائی چہ داد

کہ من روز شب جز بصحرا نیم — ولی پیش خورشید پیدا نیم

ترجمہ:

اگر تم نے باغ اور جنگل میں دیکھا ہو تو رات کے وقت ایک کیڑا یعنی جگنو چراغ کی طرح چمکتا ہے، کسی نے اس سے پوچھا اے رات کو چمکتے والے پرندے کیا بات ہے کہ دن کو تم باہر نہیں آتے۔ دیکھو

مٹی سے پیدا ہونے والے اس کیڑے نے کیا عالمانہ جواب دیا کہ میں تو دن رات صحرا میں ہی ہوتا ہوں لیکن سورج کے سامنے نظر نہیں آتا ہوں۔ (بوستان سعدی باب 3)

اسی حقیقت کو رومی اللہ تعالٰی کی بارگاہ میں اس طرح عرض کرتے ہیں:

ما کہ باشیم ای تو ما را جان جان　　تا کہ ما باشیم با تو درمیان

ما عدمہا ایم ہستی ہا نما　　تو وجود مطلق و ہستی ما

ترجمہ: اے ہماری جان کی جان، ہم کیا چیز ہیں کہ تیرے سامنے آکر موجود ہونے کا دعوٰی کریں، تیرے سامنے تو ہم ہستی نما عدم ہیں اور تو وجود مطلق ہے اور ہماری ہستی اور ہمارا وجود تجھ سے ہے۔

وحدت الوجود ایک قلبی احساس:

وحدت الوجود کے حوالے سے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ یہ ایک نظریے کے علاوہ ایک قلبی کیفیت اور احساس کا نام ہے۔ ایک عام انسان اگر اپنے جیسے کسی انسان کے عشق میں گرفتار ہو جائے تو چاندنی راتوں میں چاند میں اپنے محبوب کا چہرہ دیکھتا ہے، موسم بہار میں باغ و گلستاں میں پھول اور پتیوں میں اپنے محبوب کا چہرہ دیکھتا ہے، ہر حسین منظر میں اپنے محبوب کے حسن کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اسے اپنے محبوب کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ بالکل اسی طرح ایک عارف کائنات کی ہر چیز میں محبوب حقیقی کو دیکھتا ہے۔ جب وہ پھول میں خدا کو دیکھتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ پھول کو دیکھ کر پھول کو خدا کہہ رہا ہوتا ہے، درحقیقت وہ پھول کو دیکھ ہی نہیں رہا ہوتا، پھول میں خدا کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ جب وہ بت کو دیکھتا ہے تو وہ بت کو دیکھ ہی نہیں رہا ہوتا، اس میں خدا کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اس کے لیے ہر چیز جلوہ جاناں ہوتی ہے۔ اسی کو وحدت الشہود بھی کہتے ہیں۔

حلول اور وحدت الوجود:

علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 53 پر اپنی ناقص معلومات کی بنیاد پر حلول اور وحدت الوجود کو تصوف کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اگر کوئی شخص تھوڑی سی سمجھ بوجھ رکھتا ہو اور وحدت الوجود اور حلول کے معنی بھی جانتا ہو تو وہ قطعاً ایسی لایعنی بات نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ وحدت الوجود کے معنی یہ ہیں

کہ حقیقی وجود ایک ہی ہے اور وہ اللہ کا وجود ہے، کوئی دوسرا حقیقی وجود دسرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ جبکہ حلول کے معنی یہ ہیں کہ دو حقیقی وجود ایک ہو جائیں۔ ایک وجود دوسرے وجود میں داخل اور اس میں ضم ہو جائے۔ صوفیاء اور تصوف کو حلول کا قائل کہنے والے اور محمود شبستری پر تنقید کے تیر چلانے والے علامہ نجفی صاحب اور ان کے ہم مشرب علمائے کرام اگر گلشن راز کو ایک نظر دیکھ لیتے تو ایسی کچی اور کمزور باتیں نہ کرتے ۔ شیخ محمود شبستری گلشن راز میں وحدت الوجود کی تشریح کرنے کے بعد حلول کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

حلول واتحاد اینجا محال است　　　که در وحدت دوئی عین ضلال است

ترجمہ: یہاں (یعنی عرفان وتصوف کے مکتب میں) حلول واتحاد محال ہے اس لیے کہ وحدت کے مکتب میں دوئی عین گمراہی ہے۔ یعنی جب کوئی دوسرا حقیقی وجود ہی نہیں رکھتا تو پھر حلول کی کوئی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے۔

وحدت الشہود:

جو اہل تصوف وعرفان وحدت الوجود کے قائل ہیں وہ لامحالہ وحدت الشہود کے بھی قائل ہیں۔ اس لیے کہ جب یہ طے ہو گیا کہ حقیقی وجود صرف اللہ تعالیٰ کا وجود ہے، دیگر سب موجودات اللہ کے وجود کے سامنے ہیچ ہیں اور اسی کی ذات وصفات کی تجلی ہیں تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ ہر چیز میں اسی کا مشاہدہ ہے۔ اس کے برعکس جو اہل تصوف وعرفان وحدت الوجود کے قائل نہیں ہیں اور سب موجودات کے وجود کو حقیقی وجود سمجھتے ہیں اور درحقیقت کثرت الوجود کے قائل ہیں وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کثیر موجودات میں سے ہر موجود اپنے خالق کی صفات کمال کی تجلی کا مظہر ہے۔ ذرے سے لے کر آفتاب تک اور آفتاب سے لے کر کہکشانوں تک، ہر چیز میں اسی کے جلوے کا شہود ہے۔

بنابرین اگر وحدت الوجود کو کفر کہنے کی کوئی گنجائش بنتی بھی ہو، جو کہ نہیں بنتی، تو وحدت الشہود کو غلط کہنا تو کسی بھی لحاظ سے درست نہیں ہے۔ وحدت الشہود کی بنیاد پر صوفیاء وعرفاء پر حملے کرنا درحقیقت تصوف وعرفان کے خلاف ایک متعصّبانہ رویے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

☆☆☆

فناء:

وحدت الوجو، وحدت الشہود اور حلول کا ذکر ہو گیا تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر فنا کے بارے میں بھی بات کر لی جائے۔ فنا کے بارے میں بھی عرفان وتصوف کے مخالف مولوی صاحبان نے عوام کو گمراہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ عرفان وتصوف کے مخالف مولوی صاحبان کہتے ہیں کہ صوفیا وعرفاء فنا کے قائل ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی ذات اللہ کی ذات میں فنا ہو جاتی ہے اور ان کا وجود اللہ کے وجود میں مل جاتا ہے جو درحقیقت حلول ہی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن یہ محض ایک گمراہ کن مغالطہ ہے۔ فنا کے حقیقی معنی سمجھنے کے لیے پھر ایک مثال پر غور فرمائیں: رات کے وقت جب مطلع بالکل صاف ہو اور آپ آسمان پر نظر ڈالیں تو آپ کو ہزاروں ستارے جھلمل جھلمل کرتے نظر آئیں گے۔ پھر رات ختم ہو جاتی ہے، سورج طلوع ہو جاتا ہے، دن نکل آتا ہے اور ہر طرف سورج کی روشنی پھیل جاتی ہے۔ کیا آپ کو ستارے نظر آتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ کیا دن کے وقت آسمان پر ستارے موجود نہیں ہوتے؟ یقیناً ہوتے ہیں۔ کیا سب ستاروں کا وجود سورج کے وجود میں مدغم ہو جاتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ پھر نظر کیوں نہیں آتے؟ جواب بالکل واضح ہے کہ سارے ستارے اپنے اپنے مقام پر موجود ہوتے ہیں، ان کی روشنی بھی موجود ہوتی ہے لیکن سورج کی روشنی کے سامنے ستاروں کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے، سورج کی روشنی ستاروں کی روشنی پر غالب آ جاتی ہے۔ ستارے بھی موجود ہوتے ہیں اور ان کی روشنی بھی، لیکن سورج کی روشنی کے سامنے ستارے نظر آتے ہیں نہ ان کی روشنی۔

انسان جب تک معرفت شہودی کے نور سے محروم ہوتا ہے تو اس کی زندگی تاریک رات کی مانند ہوتی ہے۔ اسے اللہ کے وجود کے سوا ہر چیز موجود نظر آ رہی ہوتی ہے۔ لیکن جب معرفت شہودی کا سورج کسی عارف کے دل پر طلوع ہوتا ہے تو معاملہ برعکس ہو جاتا ہے اور اسے اللہ کے وجود کے سوا کسی اور چیز کا وجود نظر ہی نہیں آتا، نہ ہی اپنا وجود نظر آتا ہے۔ ہر چیز کا وجود اللہ کے وجود کے سامنے ایسا ہو جاتا ہے جس طرح رات کے اندھیرے میں جھلمل جھلمل کرنے والے ستارے اور ان کی چمک دمک دن کے وقت سورج کی روشنی کے سامنے اپنے وجود کے باوجود اپنی نمود کو کھو دیتے ہیں۔

قارئین محترم! علامہ نجفی صاحب دام ظلہ کی تالیف اقامۃ البرہان میں اور بھی بہت سی کمزور اور

کچی باتیں موجود ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔لیکن ہم اس کتاب کو اسی مقام پر ختم کرتے ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ علامہ نجفی صاحب دام ظلہ نے تصوف وعرفان کی رد میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور بحمد اللہ اس تحریر سے ہمارا یہ مقصد بخوبی پورا ہو جاتا ہے۔

حدیث عنوان بصری

آخر پر امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک حدیث کا ذکر بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ حدیث حدیث عنوان بصری کہلاتی ہے اس لیے کہ اس کے راوی کا نام عنوان بصری ہے۔آیت اللہ علامہ سید علی قاضی طباطبائی رضوان اللہ علیہ جو عرفان میں علامہ سید محمد حسین طباطبائی رضوان اللہ علیہ اور آیت اللہ بہجت رضوان اللہ علیہ کے مربی اور مرشد تھے، اپنے عرفان کے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ اس حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے عنوان بصری کے لیے جو ہدایات ارشاد فرمائی ہیں ان کو لکھ کر اپنے پاس رکھا کریں اور دن میں کئی بار پڑھا کریں، ان کا مراقبہ کیا کریں اور ان کی روشنی میں اپنا محاسبہ کیا کریں۔آیت اللہ علامہ سید علی قاضی طباطبائی رضوان اللہ علیہ کوئی گمنام اور گوشہ نشین عارف نہیں تھے۔وہ حوزہ علمیہ کے رائج علوم میں مہارت اور کمال رکھنے کے ساتھ ساتھ فلسفہ، عرفان اور تفسیر قرآن بالقرآن پر بہت گہری دسترس رکھتے تھے۔علامہ طباطبائی نے عرفانی تربیت کے علاوہ تفسیر القرآن بالقرآن کا اسلوب بھی انہیں سے حاصل کیا۔ان کی علمی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ طباطبائی اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کہ ما ہر چہ داریم از آقای قاضی داریم۔(یعنی ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ آقای قاضی کی وجہ سے ہے)علامہ قاضی امیر المومنین علیہ السلام کے حرم اطہر کے نزدیک قبرستان وادی السلام میں مدفون ہیں۔اس حدیث کو پڑھ کر قارئین محترم کو بہت اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا کہ شیعہ عرفاء کے ہاں عرفانی تربیت کی کن بنیادوں پر کی جاتی ہے۔ملاحظہ فرمائیے:

علامہ مجلسی کہتے ہیں : **اقول : وجدت بخط شیخنا البهائی قدس الله روحه ما هذا لفظه:قال الشیخ شمس الدین محمد بن مکی نقلت من خط الشیخ احمد الفراهانی رحمه الله عن عنوان البصری و کا ن شیخا کبیرا اتی علیه اربع و تسعون سنة۔قال کنت اختلف الی**

مالک بن انس سنین فلما قدم جعفر الصادق المدینة اختلفت الیه و احببت ان آخذه عنه کما آخذ عن مالک۔فقال لی یوما :انی رجل مطلوب و مع ذالک لی اوراد فی کل ساعة من آناء اللیل و النهار٬فلاتشغلنی عن وردی و خذ عن مالک و اختلف الیه کما کنت تختلف الیه۔ فاغتممت من ذالک و خرجت من عنده و قلت فی نفسی لو تفرس فی خیرا لما زجرنی عن الاختلاف الیه و الاخذ عنه۔فدخلت مسجد الرسول صلی للہ علیه و آله و سلمت علیه ثم رجعت من الغد الی الروضه و صلیت فیها رکعتین و قلت اسئلک یا اللہ ان تعطف علی قلب جعفر و ترزقنی من علمه ما اهتدی به الی صراطک المستقیم و رجعت الی داری مغتما و لم اختلف الی مالک بن انس لمااشرب قلبی من حب جعفر۔ فما خرجت من داری الا الی الصلاة المکتوبة حتی عیل صبری۔فلما ضاق صدری تنعلت و تردیت و قصدت جعفرا و کان بعد ما صلیت العصر۔فلما حضرت باب داره استاذنت علیه فخرج خادم له فقال ما حاجتک ؟فقلت السلام علی الشریف ۔فقال هو قائم فی مصلاه ۔فجلست بحذاء بابه ۔فما لبث الا یسیرا اذا خرج خادم فقال: ادخل علی برکة اللہ فدخلت و سلمت علیه فرد السلام و قال اجلس غفر اللہ لک۔ فجلست فاطرق ملیا ثم رفع راسه و قال ابو من ؟قلت ابو عبد اللہ۔ قال ثبت اللہ کنیتک و وفقک یا اباعبد اللہ ۔ ما مسئلتک ؟ فقلت فی نفسی لو لم تکن من زیارته و التسلیم غیر هذاالدعا لکان کثیرا۔ثم رفع راسه ثم قال ما مسئلتک؟فقلت سئلت اللہ ان یعطف قلبک علی و یرزقنی من علمک و ارجو ان اللہ تعالیٰ اجابنی فی الشریف ما سئلته۔ فقال یا اباعبد اللہ !لیس العلم بالتعلم انما هو نور یقع فی قلب من یرید اللہ تبارک و تعالی ان یهد یه ۔فان اردت العلم فاطلب فی قلبک حقیقة العبودیه و اطلب العلم باستعماله و استفهم للہ یفهمک ۔قلت یا شریف فقال قل یا اباعبد اللہ۔قلت یا اباعبد اللہ !ما حقیقة العبودیة؟قال ثلاثة اشیاء :ان لا یری العبد لنفسه فیما خوله اللہ ملکا٬لان العبید لا یکون لهم ملک۔یرون المال مال اللہ ۔یضعونه حیث امرهم اللہ به۔و لا یدبر العبد لنفسه تدبیرا و جملة اشغاله فیما امره اللہ تعالیٰ به و نهاه عنه۔فاذا لم یر العبد لنفسه فیما خوله اللہ تعالی ملکا هان علیه الانفاق فیما امر اللہ

تعالیٰ ان ینفق فیه۔فاذا فوض العبد تدبیر نفسه علی مدبره هان علیه مصایب الدنیا و اذا شتغل العبد بما امره الله تعالیٰ و نهاه لا یتفرغ منهما الی المراء و المباهاة مع الناس۔فاذا اکرم الله العبد بهذه الثلاثه هان علیه الدنیا و ابلیس و الخلق و لا یطلب الدنیا تکاثرا و تفاخرا و لا یطلب ما عند الناس عزا و علوا و لا یدع ایامه باطلا ۔ فهذا اول درجة التقیٰ قال الله تبارک و تعالی: تلک الدار الآخرة نجعلها للذین لا یریدون فی الارض علوا و لا فسادا و العاقبة للمتقین ۔ قلت یا ابا عبد الله ! اوصنی قال اوصیک بتسعته اشیاء ۔فانها وصیتی لمریدی الطریق الله تعالیٰ و الله اسئل ان یوفقک لاستعماله ۔ثلاثة منها فی ریاضة النفس و ثلاثة منها فی الحلم و ثلاثة منها فی العلم۔

اما اللواتی فی الریاضه :فایاک ان تاکل مالا تشتهیه فانه یورث الحماقة و البله ۔و لا تاکل الا عند الجوع ۔و اذا اکلت فکل حلالا و سم الله و اذکر حدیث الرسول صلی الله علیه و آله :ما ملاء آدمی وعاء شر من بطنه فان کان و لا بد فثلث لطعامه و ثلث لشرابه و ثلث لنفسه۔

و اما اللواتی فی الحلم: فمن قال لک : ان قلت واحدة سمعت عشرا فقل ان قلت عشرا لم تسمع واحدة ۔ و من شتمک فقل: ان کنت صادقا فیما تقول فا سئل الله تعالیٰ ان یغفرلی و ان کنت کاذبا فیما تقول فالله اسئل ان یغفرک ۔ و من وعدک بالخنیٰ فعده بالنصیحة۔

اما اللواتی فی العلم:فاسئل العلماء ما جهلت ، و ایاک ان تسئلهم تعنتا و تجربة، و ایاک ان تعمل برایک شیئا و خذ بالاحتیاط فی جمعی ما تجد الیه سبیلا ، و اهرب من الفتیا هربک من الاسد و لا تجعل رقبتک للناس جسرا ۔ قم عنی یا ابا عبد الله فقد نصحت لک و لا تفسد علی وردی فانی امرء ضنین بنفسی ۔ و السلام علی من اتبع الهدی۔

ترجمہ: علامہ مجلسی کہتے ہیں کہ میں نے شیخ بہائی قدس اللہ روحہ کے ہاتھ کی تحریر دیکھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: شمس الدین محمد بن مکی کہتے ہیں کہ میں نے شیخ احمد فراہانی رحمہ اللہ کی تحریر سے نقل کیا ہے جو انہوں نے عنوان بصری سے روایت کی ہے۔عنوان بصری جنہوں نے چورانوے برس عمر پائی کہتے ہیں کہ میں کئی سال تک مالک بن انس کے ہاں آتا جاتا تھا۔ پھر جب امام جعفر صادق علیہ السلام مدینہ تشریف

لائے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ جس طرح مالک بن انس سے علم حاصل کرتا ہوں اسی طرح ان سے علم حاصل کروں۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا: میں (حکومت کو) مطلوب رہتا ہوں، اس کے علاوہ دن اور رات کے اوقات میں میرے بہت سے اوراد ہوتے ہیں لہٰذا تم میرے اوراد میں خلل نہ ڈالا کرو اور جس طرح مالک بن انس سے علم حاصل کر رہے تھے انہیں سے علم حاصل کرتے رہو۔

میں اس بات سے غمگین ہوا اور ان کے گھر سے باہر چلا گیا اور اپنے دل میں سوچنے لگا کہ اگر انہیں مجھ میں کوئی خیر اور بھلائی نظر آئی ہوتی تو اس طرح مجھے اپنے پاس آنے اور علم حاصل کرنے سے نہ روکتے۔ پھر میں مسجد نبوی میں داخل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سلام کیا۔ اگلے دن پھر میں آنحضرت کے روضہ مبارک پر حاضر ہوا اور دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے دل کو میری طرف پھیر دے اور مجھے ان سے وہ علم میں سے عطا فرما جس سے میں تیری صراط مستقیم کی طرف ہدایت پا سکوں۔ پھر میں غمگین حالت میں اپنے گھر واپس چلا گیا اور چونکہ میرے دل میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی محبت گھر کر چکی تھی میں مالک بن انس کی طرف نہیں گیا۔ پھر میں اپنے گھر میں بند ہو کر رہ گیا اور صرف فرض نماز ادا کرنے کے لیے گھر سے نکلتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے صبر کا پیالہ لبریز ہو گیا۔ ایک دن جب میرا دل بہت تنگ ہوا تو میں نے جوتے پہنے اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے گھر کی طرف چل پڑا۔ میں اس وقت عصر کی نماز سے فارغ ہو چکا تھا۔ جب میں ان کے گھر کے دروازے کے سامنے آیا اور اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی تو ان کا ایک خادم باہر نکلا اور مجھ سے کہا: تمہاری کیا حاجت ہے؟ میں نے کہا: شریف (یعنی امام جعفر صادق علیہ السلام) پر سلام ہو۔ خادم نے کہا وہ اپنے مصلا پر کھڑے نماز ادا کر رہے ہیں۔ پس میں ان کے دروازے کے سامنے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر گزری کہ خادم باہر نکلا اور بولا: اللہ کی برکت کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ پس میں داخل ہوا اور انہیں سلام کیا۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: بیٹھ جاؤ اللہ تمہاری مغفرت کرے۔ پس میں بیٹھ گیا۔ پھر آپ نے تھوڑی دیر کے لیے اپنا سر جھکایا، پھر آپ نے سر اٹھایا اور مجھ سے پوچھا: تمہاری کنیت کیا ہے؟ میں نے کہا: ابوعبداللہ۔ آپ نے فرمایا: اے ابوعبداللہ! اللہ تمہاری کنیت کو قائم رکھے اور تجھے توفیق عطا فرمائے۔ اس پر میں نے دل میں کہا کہ اگر ان کی زیارت اور ان کو سلام کرنے کے نتیجہ میں اس دعا کے سوا مجھے اور کچھ نہ بھی ملے تو یہی

بہت زیادہ ہے۔ پھر آپ نے سر اٹھایا اور فرمایا: تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ میں نے سر اٹھایا اور کہا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ آپ کے دل کو میری طرف پھیر دے اور آپ کے علم سے مجھے عطا فرمائے اور مجھے امید ہے کہ شریف کے بارے میں (یعنی آپ کے بارے میں) اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کر لی ہے۔ پس آپ نے فرمایا: اے ابوعبداللہ! علم سیکھنے سکھانے سے نہیں آتا، وہ تو ایک نور ہے جو اس شخص کے دل میں روشن ہوتا ہے جسے اللہ تبارک وتعالی ہدایت دینا چاہے۔

پس اگر تم علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے دل میں بندگی کی حقیقت کی طلب پیدا کرو، اور علم پر عمل کرنے کے ذریعے علم حاصل کرو اور سمجھو، اللہ تمہیں سمجھ عطا کرے۔ میں نے کہا: اے شریف! تو آپ نے فرمایا: کہو اے ابوعبداللہ۔ میں نے کہا: یا اباعبداللہ! عبودیت کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: تین چیزیں: ایک یہ کہ اللہ نے جو کچھ عبد (یعنی بندے) کو دیا ہے بندہ اپنے آپ کو اس کا مالک نہ سمجھے۔ اس لیے کہ عبد (یعنی بندہ) کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ وہ مال کو اللہ کی ملکیت سمجھتے ہیں اور اسے اسی مقام پر رکھتے ہیں جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ بندہ اپنے معاملات کی تدبیر نہ کرے اور اس کی ساری توجہ ان چیزوں میں ہو جن کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور جن کے کرنے سے اللہ نے روکا ہے۔ جب بندہ اپنے آپ کو ان چیزوں کا مالک نہیں سمجھتا جو اللہ نے اس کے سپرد کر رکھی ہیں تو پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ اور جب بندہ اپنے معاملات کی تدبیر اللہ پر چھوڑ دیتا ہے تو دنیا کی مصیبتیں اس پر آسان ہو جاتی ہیں۔ اور جب بندہ اپنی توجہ ان چیزوں پر مرکوز رکھتا ہے جن کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا اور جن سے اللہ نے منع کیا ہے تو اسے ان سے ہی فرصت نہیں ملتی کہ وہ لوگوں کے ساتھ بحث اور جھگڑا کرے یا ان پر اپنی برتری ثابت کرے۔ پس جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو ان تین باتوں سے نواز دے تو دنیا، ابلیس اور لوگ اس کے لیے آسان ہو جاتے ہیں۔ وہ دنیا کو فخر وتکبر کے لیے اور دوسروں کے سامنے مال و دولت کی کثرت کے مظاہرے کے لیے طلب نہیں کرتا، اور جو عزت لوگوں کے پاس ہے اس کی بھی طلب نہیں کرتا اور اپنی زندگی کے ایام کو باطل میں نہیں گزارتا۔ پس یہ تقویٰ کا پہلا درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لیے بنائیں گے جو اس دنیا میں برتری اور فساد کے طالب نہیں ہوتے اور عاقبت متقین کے لیے ہے۔

میں نے کہا یا اباعبداللہ! مجھے نصیحت فرمایئے۔ آپ نے فرمایا: میں تجھے نو باتوں کی نصیحت کرتا

ہوں۔ میری یہ نصیحت ان سب لوگوں کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے کا ارادہ رکھتے ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ تمہیں اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ان میں سے تین کا تعلق نفس کی ریاضت سے ہے، تین کا تعلق حلم سے ہے اور تین کا تعلق علم سے ہے۔

وہ تین چیزیں جن کا تعلق ریاضت سے ہے یہ ہیں: خبردار! جب تک اشتہاء یعنی بھوک نہ ہو کوئی چیز نہ کھاؤ کیونکہ اس سے حماقت اور کند ذہنی پیدا ہوتی ہے۔ صرف اسی وقت کھاؤ جب تمہیں بھوک لگے۔ جب کھاؤ تو حلال کھاؤ اور اللہ کا نام لے کر کھاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کو یاد رکھو کہ سب سے برا برتن جسے کوئی آدمی بھرتا ہے وہ اس کا پیٹ ہے۔ پس لازم ہے کہ تمہارے پیٹ کا ایک تہائی کھانے کے لیے، ایک تہائی پینے کے لیے اور ایک تہائی سانس لینے کے لیے ہو۔

وہ تین چیزیں جن کا تعلق حلم سے ہے یہ ہیں: اگر کوئی تم سے یہ کہے کہ اگر تم نے ایک بات کہی تو جواب میں دس سنو گے، تو تم اس کے جواب میں کہو کہ اگر تم دس کہو گے تو ایک بھی نہیں سنو گے۔ جو تمہیں برا بھلا کہے اسے کہو کہ اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو اللہ مجھے معاف کرے اور اگر تم جھوٹ کہہ رہے ہو تو اللہ تمہیں معاف کرے۔ اور اگر کوئی تمہیں دھمکی دے تو تم اسے کہو کہ میں تمہارا خیر خواہ رہوں گا۔

وہ تین چیزیں جن کا تعلق علم سے ہے یہ ہیں: جس چیز کا علم نہیں رکھتے علماء سے پوچھو۔ اور خبردار کج بحثی کے لیے یا ان کو آزمانے کے لیے سوال نہ کرنا۔ اور خبردار کبھی اپنی رائے پر عمل نہ کرنا اور جن چیزوں کا علم حاصل کرنے کا کوئی راستہ موجود نہیں ہے ان میں جہاں تک ہو سکے احتیاط سے کام لو۔ اور فتویٰ دینے سے ایسے بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو، اور اپنی گردن کو لوگوں کے لیے پل نہ بناؤ۔ اے ابا عبداللہ اب اٹھو اور جاؤ، میں نے تمہیں نصیحت کر دی ہے، میرے ورد میں خلل نہ ڈالو، میں اپنی ذات کے بارے میں بہت بخل سے کام لیتا ہوں (یعنی اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی غیر ضروری کام میں ضائع نہیں کرتا) اور سلامتی ہے اس کے لیے جو ہدایت کی پیروی کرے''۔

مومنین گرامی قدر! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے مکتب میں عرفانی تربیت کا کیا انداز تھا۔

مصباح الشریعه

حدیث عنوان بصری کے بعد یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کتاب مصباح الشریعہ کے تین ابواب اوران کا اردو ترجمہ مومنین کرام کی خدمت میں پیش کیا جائے تا کہ انہیں شیعہ عرفان کے خدوخال سے کچھ آشنائی ہوجائے۔ کتاب مصباح الشریعہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منسوب ہے اور شیعہ عرفاء اور علمائے اخلاق میں بہت قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کتاب کے سوابواب ہیں۔ استاد محترم آیت اللہ العظمٰی ڈاکٹر محمد صادقی تہرانی رضوان اللہ علیہ اپنے دروس عرفان اور دروس اخلاق میں اس کتاب کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اس کتاب میں سے باب معرفت، باب احکام اور باب الذکر کی عربی عبارت اوراردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

باب المعرفه

قال الصادق علیه السلام: العارف شخصه مع الخلق و قلبه مع الله، لو سهیٰ قلبه عن الله طرفة عین لمات شوقا الیه، والعارف امین ودائع الله و کنز اسراره و معدن انواره و دلیل رحمته علی خلقه و مطیة علومه و میزان فضله و عدله، و قدغنی عن الخلق و المرادو الدنیا، فلا مونس له سوای الله، و لا نطق و لا اشار و لا نفس الا بالله و لله و من الله و مع الله۔ فهو فی ریاض قدسه متر ددو من لطائف فضله الیه متزود۔ و المعرفة اصل و فرعه الایمان۔

ترجمہ:

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: عارف جسمانی طور پر مخلوق کے ساتھ ہوتا ہے مگر اس کا دل اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر اس کا دل آنکھ جھپکنے جتنی دیر کے لیے بھی اللہ سے غافل ہوجائے تو اس کی تلافی کے شوق میں اس کی موت واقع ہوجائے۔ عارف اللہ کی امانتوں کا امین ہوتا ہے، اس کے رازوں کا خزانہ ہوتا ہے اور اس کے بندوں کو اس کی رحمت کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہ اس کے علوم کا مرکب اور اس کے

فضل اورعدل کا میزان ہوتا ہے، وہ مخلوق سے، مرادوں سے اور دنیا سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اللہ کے سوا اس کا کوئی مونس نہیں ہوتا، اس کا بولنا، اشارہ کرنا اور سانس لینا اللہ کے سبب سے، اللہ کی طرف سے، اللہ کے لیے اور اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اس کی قداست اور پاکیزگی کے باغوں میں آتا جاتا ہے اور اس کے فضل و کرم کے لطائف سے اس کی طرف زادراہ جمع کرتا ہے۔ معرفت اصل اور ایمان اس کی فرع ہے۔

☆☆☆

باب الاحکام

قال الصادق علیہ السلام : اعراب القلوب اربعة انواع:رفع و فتح و خفض و وقف ۔فرفع القلب فی ذکر اللہ تعالیٰ و فتح القلب فی الرضا عن اللہ تعالیٰ و خفض القلب فی الاشتغال بغیر اللہ تعالیٰ و وقف القلب فی الغفلة عن اللہ تعالیٰ ۔ الا تری ان العبد اذا ذکر اللہ بالتعظیم خالصا ارتفع کل حجاب کان بینه و بین اللہ تعالیٰ قبل ذالک ۔و اذا انقاد القلب لمورد قضاء اللہ تعالیٰ بشرط الرضا عنه کیف ینفتح بالسرور و الروح و الراحة ۔ و اذا اشتغل قلبه بشیء من اسباب الدنیا کیف تجده اذا ذکر اللہ بعد ذالک منخفضا مظلما کبیت خراب خاو لیس فیها عمارة و لا مونس ۔ و اذا غفل عن ذکر اللہ تعالیٰ کیف تراہ بعد ذالک موقوفا محجوبا قد قسی و اظلم منذ فارق نور التعظیم ۔فعلامة الرفع ثلا ثة اشیاء:وجود الموافقه و فقد المخالفه و دوام الشوق۔وعلامة الفتح ثلاثة اشیاء:التوکل و الصدق و الیقین ۔ وعلامة الخفض ثلاثة اشیاء: العجب و الریاء و الحرص۔ وعلامة الوقف ثلاثة اشیاء : زوال حلاوة الطاعة و عدم مرارة المعصیه و التباس علم الحلال بالحرام

ترجمہ:

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: دل کی چار حالتیں ہوتی ہیں: بلندی، گشائش، پستی اور توقف۔ دل کی بلندی اللہ کے ذکر میں ہوتی ہے، دل کی گشائش اللہ تعالیٰ سے راضی ہونے میں ہوتی ہے، دل کی پستی غیر اللہ میں مشغول ہونے سے ہوتی ہے اور دل کا توقف اللہ تعالیٰ سے غافل ہونے میں ہوتا ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جب بندہ اللہ کی عظمت کا احساس کرتے ہوئے اور خلوص دل سے اللہ کا ذکر کرتا

ہے تو اس کے اور اللہ کے درمیان سے وہ سب حجاب برطرف ہوجاتے ہیں جو اس سے پہلے موجود ہوتے ہیں۔اور جب وہ اللہ کے کسی فیصلے کو پسندیدگی کی شرط کے ساتھ قبول کر لیتا ہے تو دل کس طرح سرور، راحت اور اطمینان کے ساتھ کھل جاتا ہے۔اور جب اس کا دل اسباب دنیا میں سے کسی چیز میں مشغول ہوجاتا ہے تو اس کے بعد جب وہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو اسے کیسا پست اور تاریک پاتا ہے، ایک ایسے گھر کی طرح جو ویران اور برباد ہو چکا ہو جس میں کوئی آباد نہ ہو اور وہاں کوئی انس و رغبت کا سامان نہ ہو۔اور جب وہ اللہ کے ذکر سے غافل ہوجاتا ہے تو وہ کیسے متوقف ہوجاتا ہے اور اس پر حجاب طاری ہوجاتا ہے اس لیے کہ جب وہ اللہ کی عظمت کے نور سے جدا ہوتا ہے تو کیسے سخت اور تاریک ہوجاتا ہے۔

پس دل کی بلندی کی تین علامتیں ہیں: اللہ کے احکام کی موافقت کا موجود ہونا، اللہ کے احکام کی مخالفت کا ناپید ہونا اور اللہ کی عبادت و اطاعت اور اس کے ذکر کا دائمی شوق۔دل کی گشائش کی بھی تین علامتیں ہیں: توکل، صدق اور یقین۔دل کی پستی کی بھی تین علامتیں ہیں: خود پسندی، ریاکاری اور حرص۔ اور وقف کی بھی تین علامتیں ہیں: اطاعت و عبادت کی شیرینی کا زائل ہوجانا، گناہ اور معصیت کی تلخی کا ناپید ہوجانا اور حلال و حرام کے علم کا مخلوط ہوجانا۔

باب الذکر

قال الصادق علیه السلام :من کان ذاکرا الله علی الحقیقة فهو مطیع و من کان غافلا عنه فهو عاص، و الطاعة علامة الهدایه و المعصیة علامة الضلاله و اصلهما من الذکر و الغفلة۔ فاجعل قلبک قبلة للسانک لا تحرکه الا باشارة القلب و موافقة العقل و رضی الایمان، فان الله تعالیٰ عالم بسرک و جهرک، و کن کالنازع روحه او کالواقف فی العرض الاکبر غیر شاغل نفسک عما عناک مما کلفک به ربک فی امره و نهیه و وعده و وعیده، و لا تشغلها بدون ما کلفک به ربک، و اغسل قلبک بماء الحزن (والخوف)، و اجعل ذکر الله تعالیٰ من اجل ذکره ایاک فانه ذکرک وهو غنی عنک ،فذکره لک اجل و اشهی و اتم من ذکرک له و اسبق ،و معرفتک بذکره لک تورثک الخصوع و الاستحیاء و الانکسار، و یتولد من ذالک رؤیة کرمه و فضله السابق، و تصغر عند ذالک طاعاتک و ان کثرت فی جنب منته و

تخلص لوجهه۔ و رؤیتک ذکرک له تورثک الریاء و العجب والسفه والغلظة فی خلقه واستکثار الطاعة و نسیان فضله و کرمه، ولا تزداد بذالک من الله الا بعدا ولا تستجلب به علی مضی الایام الا وحشة، والذکر ذکران: ذکر خالص بموافقة القلب وذکر صادق لک بنفی ذکر غیره کما قال رسول الله صلی الله علیه وآله: انا لا احصی ثناء علیک، انت کما اثنیت علیٰ نفسک، فرسول الله صلی الله علیه وآله وسلم لم یجعل لذکر الله تعالیٰ مقدارا عند علمه بحقیقة سابقة ذکر الله عز و جل له من قبل ذکره له، فمن دونه اولی، فمن اراد ان یذکر الله تعالی فلیعلم انه مالم یذکر الله العبد بالتوفیق لذکره لا یقدر العبد علی ذکره۔

ترجمہ:

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: جو کوئی حقیقی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے وہ اس کا اطاعت گزار ہو جاتا ہے اور جو اس سے غافل ہوتا ہے وہ معصیت کار ہوتا ہے۔ اطاعت ہدایت کی علامت ہے جبکہ معصیت گمراہی کی علامت ہے اور ان دونوں کی بنیاد ذکر اور غفلت ہے۔ پس تم اپنے دل کو اپنی زبان کا قبلہ بنالو اور اسے اس کے حکم، عقل کی موافقت اور ایمان کی رضامندی کے بغیر حرکت نہ دو۔ اور یقین جانو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن اور ظاہر کو جانتا ہے، اور اس شخص کی طرح رہا کرو جس کی جان نکل رہی ہو یا جو محشر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑا ہو، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے امر و نہی اور وعدہ ووعید کے ذریعے جن چیزوں کا تمہیں مکلف بنایا ہے اپنے اپ کو ان کے علاوہ کسی چیز میں مشغول نہ کرو، اور اپنے دل کو غم اور خوف کے پانی سے غسل دو اور یہ سمجھ کر اللہ کا ذکر کیا کرو کہ اللہ تمہارا ذکر کرتا ہے، وہ تمہارا ذکر کرتا ہے حالانکہ وہ تم سے غنی اور بے نیاز ہے، اس کا تجھے یاد کرنا تیرے اسے یاد کرنے سے زیادہ جلالت، ابہت، تمامیت اور تقدم رکھتا ہے، جب تمہیں اس بات کی معرفت حاصل ہو جائے کہ وہ تمہیں یاد رکھتا ہے تو یہ تمہارے اندر خضوع، حیا اور عاجزی وانکساری پیدا کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ اور اثر یہ ہوتا ہے کہ گویا تم اس کے سابق فضل و کرم کو دیکھ رہے ہو، اس وقت تمہاری عبادت خواہ کتنی زیادہ ہی کیوں نہ ہو اس کے فضل اور رحمت کے سامنے ناچیز نظر آنے لگتی ہے اور اس کی خوشنودی کے لیے خالص ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر تم اپنی نظر اس بات پر رکھو گے کہ تم اس کا ذکر کر رہے ہو تو اس کے نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے اندر ریاکاری، خود پسندی، کم عقلی اور

لوگوں کے ساتھ درشت مزاجی کی کیفیت پیدا ہو جائی گی، تم اپنی اطاعت اور عبادت کو زیادہ اور اس کے فضل وکرم کو کم دیکھنے لگو گے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ سے تمہاری دوری میں اضافہ ہوتا جائے گا اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تمہاری وحشت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اور ذکر کی دو قسمین ہیں: خالص ذکر جو دل کی موافقت کے ساتھ ہو اور وہ صادق ذکر جو غیر اللہ کے ذکر کی نفی کرنے والا ہو، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں تیری حمد وثنا اس کامل انداز میں نہیں کرسکتا جس طرح تو نے خود اپنی حمد وثنا کی ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خالص ذکر کو بھی کوئی قدر و قیمت نہیں دے رہے اس لیے کہ وہ اپنے ذکر کی بجائے اللہ تعالیٰ کے اس سابق ذکر پر نظر رکھے ہوئے ہیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حالت ہے تو دوسروں کی تو بدرجہ اولیٰ ایسی حالت ہونی چاہیے۔ پس جو کوئی اللہ کا ذکر کرنا چاہے اسے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو ذکر کی توفیق نہ ہو وہ اس کا کوئی ذکر نہیں کرسکتا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کے دلوں کو قرآن و اہلبیت کی تعلیمات پر مبنی حقیقی عرفان کے نور سے منور فرمائے۔ ہمیں اپنے فیصلوں میں عدل و انصاف کی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں ہر قسم کے تعصب و عناد سے اجتناب کی اور اپنے رویوں میں حقیقت پسندانہ طرز عمل اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

والحمد للہ رب العالمین